صُحُفًا مُّطَهَّرَةً فِيهَا كُتُبٌ قَيِّمَةٌ

سلسلۂ دار المصنفین

(عـــ ۵۷)

مقالات شبلی

جلد ہشتم

مولانا شبلی نعمانی رحمۃ اللہ علیہ

کے

قومی اور اخباری مضامین کا مجموعہ جو الندوہ، مسلم گزٹ اور دوسرے رسائل و
اخبارات سے یکجا کئے گئے

باہتمام مولوی مسعود علی صاحب ندوی

در مطبع معارف اعظم گڈھ طبع شد

۱۹۳۸ء

فہرست

مقالاتِ شبلی جلد ہشتم

بسم اللہ الرحمن الرحیم

دیباچہ

مولانا شبلی مرحوم کے مضامین کا یہ مجموعہ اُن کے متفرق اخباری مضامین مختلف مفید تجاویز اور منصوبون پر مشتمل ہے، اس مجموعہ پر سرسری نظر ڈالنے سے مصنف کی زندگی کے مختلف پہلوون پر ایک ساتھ نظر پڑ جاتی ہے، اشاعتِ اسلام، وقفِ اولاد، اوقافِ اسلامی، تعطیلِ نمازِ جمعہ، مجلسِ علم کلام، اشاعتِ کتبِ قدیمہ، ترجمۂ انگریزی قرآن مجید، تالیف سیرۃ نبویؐ وغیرہ مختلف قومی اور مذہبی تجویزین انھون نے قوم کے سامنے پیش کین، ان مین سے کچھ کو اپنی کوششون سے پورا کر دیا، کچھ ایسی تھین جو مناسب فضا نہ ہونے سے بار آور نہیں ہوئین،

اشاعتِ اسلام کا کام انھون نے باقاعدہ شروع کر دیا تھا اور مجھے میری قومی خدمت کی تعلیم کی غرض سے مددگار ناظم بنایا تھا، یاد ہوگا کہ ۱۹۰۸ء مین ارتداد کا جو عظیم الشان طوفان اٹھا تھا، اس کے مقابلہ کے لئے جو لوگ اٹھے تھے اُن مین ایک سر برآوردہ نام مولانا مرحوم کا بھی ہے، وہ شاہجہان پور وغیرہ خود دورہ کو نکلے، راجپوتانہ کے اطراف مین معتمد آدمی بھیجے ندوہ مین سنسکرت پڑھانے کا انتظام کیا، کئی طالب علمون کو اس درجہ مین داخل کر کے

ان کو اس حد تک تیار کیا کہ اسی درجہ کے ایک مسلمان طالب علم نے شاید ۱۹۱۰ئہ کے
ندوہ کے اجلاس دہلی مین جب ٹھیٹ ہندی مین تقریر کی تو حاضرین کو اس کے پیدائشی ہندو
ہونے کا گمان ہوگیا اور وہ اس وقت دور ہوا جب لوگون نے اس سے قرآن سنانے
کی فرمایش کی، اتفاق دیکھئے کہ اس کے قرآن سنانے کا لحن بھی نہایت دلآویز تھا، اس وقت
اس نے سورۂ رحمٰن کی قرأت اس خوبی سے کی کہ سارا مجمع آئینۂ حیرت تھا، دل سینون
مین تڑپ رہے تھے اور چارون طرف سے تعریف وتحسین اور انعامات کی بارش ہورہی تھی،
وقفِ اولاد کا مسئلہ جس مین سر سید ناکام رہ چکے تھے، مولانا کی کوششون سے ایسا کامیاب
ہوا کہ حکومت وقت کو اس کے آگے سر جھکانا پڑا، اور مسٹر محمد علی جینا کی تحریک سے اسمبلی نے
اس کو قانون بنانا منظور کیا،

نماز جمعہ کی تعطیل کے مسئلہ کو اٹھایا اور اس حد تک اس کو گورنمنٹ سے منوالیا کہ
جو مسلمان نماز جمعہ مین جانا چاہین وہ ایک مقررہ وقت کے لئے جا سکتے ہین، اسی سلسلہ مین
مولانا کی ایک گفتگو یاد آئی جن دنون وہ اس تحریک کو چلارہے تھے، فرمایا بھائی اگر
تعطیل منظور ہوگئی اور مسلمان عام طور سے نماز پڑھنے نہ جائین تو اسلام کی کیسی بدنامی ہوگی،
جہانتک عام مسلمان ملازمین کا تعلق ہے، ان کا یہ خوف غلط نہ تھا،

ان کی سیرت نبوی کی تجویز ایسی سرسبز ہوئی کہ آج ہماری زبان اس مقدس لٹریچر
کی فراوانی، بلندی اور افادیت پر بجا فخر کرسکتی ہے،

عام اوقافِ اسلامی کا کام انھون نے اخیر زندگی مین شروع کیا تھا اور ناتمام رہا تھا،
مگر اکثر صوبوں میں ان کی ناتمام کوششون کی آواز بازگشت گونجی، اور سالہا سال کے
بعد صوبون کی حکومتون نے اس کے متعلق اب کچھ نہ کچھ کیا ہے،

مولانا عملاً سیاسی نہ تھے، مگر وہ اپنے خیالات مین نہایت سخت سیاسی تھے، اتحاد عالم اسلامی کے وہ پہلے سفیر تھے، علماء اور رہنمایان قوم میں سب سے پہلے ان ہی نے اسلامی ممالک کا سفر کیا، اور سلطان ٹرکی سے اعزاز کا تمغہ پایا، جب وہ واپس آئے تو انگریزی حکومت نے ان پر کڑی نگرانی رکھی، کئی سال تک وہ جاسوسوں کے نرغہ میں رہے، اور یہ سمجھا جاتا تھا کہ وہ عثمانی خلافت اور اتحاد اسلامی (پین اسلامزم) کے جس سے اس زمانہ میں بہت کچھ ڈرا جاتا تھا، ہندوستان میں مبلغ ہیں، مسئلہ آرمینیا پر ان کا مضمون (جو ۱۸۹۶ء میں لکھا گیا) اسی اثر کا نتیجہ ہے،

ٹرکی جانے بلکہ علیگڈہ جانے سے بھی پہلے روم وروس کی لڑائی میں ترکون کے لئے چندہ جمع کرکے بھیجا تھا، پھر طرابلس اور بلقان کی لڑائی کے زمانہ میں ان کا جو حال تھا اُسے اس وقت تک جب تک کہ ان کی نظم "شہر آشوب اسلام" جس کی ردیف "کب تک" ہے موجود ہے، بھلایا نہیں جا سکتا، لکھنو کے جس جلسہ میں انھوں نے یہ نظم پڑھی تھی یہ کہنا چاہیئے کہ وہ طرابلس وبلقان کی ہمدردی کا جلسہ نہ تھا مجلسِ ماتم تھی، اس زمانہ میں ان پر اتنا گہرا اثر تھا کہ وہ ذرا ذرا سی بات پر رو دیتے تھے، اور کبھی کبھی جب کوئی خوشی کی خبر آتی وہ بہت خوش بھی ہو جاتے تھے،

اس زمانہ کا ایک واقعہ یاد آیا، ایک رات کو کوئی دس بجے کے قریب مجھے اور ندوہ کے بعض اور طالب علموں کو یاد فرمایا، اس ناوقت کی طلب سے ہم لوگ گھبرا گئے، پہنچے، تو دیکھا کہ سامنے مصر کے عربی اخبارات پڑے ہوئے ہیں، اور مولانا بہت خوش ہیں، فرمایا کہ بھئی! ابھی مصر کے نئے اخبارات پڑھ رہا تھا، یہ خبر پڑھکر بہت خوشی ہوئی کہ ترکوں نے طرابلس کو خود مختار بنایا، اور انور بے نے ترکوں کی فوجی ملازمت سے استعفا

دے کر طرابلس کی خود مختار حکومت کی سربراہی قبول کرلی، اکیلے خوشی مناتے نہیں بنتا تھا اس لئے تم لوگوں کو بلایا، اس کے بعد اسی وقت بازار سے مٹھائی منگوائی اور ہم لوگوں کو کھلائی،

مولانا کالج میں گو سرسید کے ساتھ رہتے تھے، مگر مذہبی اختلاف کے ساتھ ساتھ موصوف کو سرسید کے آخری سیاسی خیالات سے حد درجہ اختلاف تھا، اور اس کو وہ ہندوستانیوں اور مسلمانوں کے حق میں سخت مضر سمجھتے تھے، بلکہ علانیہ وہ کانگریس کی حمایت کرتے تھے اور اس وقت کی کانگریس کے خیالات سے پوری طرح متفق تھے، دونوں بزرگوں کا یہ سیاسی اختلاف بہت حد تک اُن کے تعلقات کو کشیدہ کرنے میں معین ثابت ہوا،

مولانا فرماتے تھے کہ ایک دفعہ یونین میں جمہوریت اور شخصی بادشاہی کے عنوان پر طالب علموں کا مناظرانہ مکالمہ تھا، سرسید، مولانا اور دوسرے استاد بھی شریک تھے مولانا نے جمہوریت کی تمہید میں زبردست تقریر فرمائی، جلسہ ختم ہوگیا، اور لوگ اپنے اپنے ٹھکانے پر گئے، صبح کو جب مولانا سرسید سے ملے تو سرسید نے کہا آپ نے مجھے رات بہت تکلیف پہنچائی رات مجھ کو اس وقت تک نیند نہیں آئی، جب تک کہ میں نے آپکی تقریر کے جواب میں ایک مضمون لکھ کر آپکے دلائل کی تردید نہ کرلی،

۱۹۱۲ء میں تقسیم بنگالہ کی تنسیخ اور طرابلس و بلقان اور مسجد کانپور کے ہنگاموں کے بدولت مسلمانوں کے ہیجان کے زمانہ میں سب سے پہلا مضمون جس نے مسلمانوں کے سیاسی خیالات کا رخ بدل دیا، مولانا کے قلم سے نکلا تھا جس کی سرخی "مسلمانوں کی پولیٹکل کروٹ" ہے، اسی کے ساتھ یا اسی کے قریب قریب زمانہ میں دوسرا انقلاب انگیز مضمون نواب وقار الملک مرحوم کا تھا، جس میں تقسیم بنگال کی تنسیخ پر غم و غصہ کا اظہار تھا، مولانا نے اس مضمون

کا ذکر کیا تھا، اور اس کو "بہادرانہ مضمون" فرمایا تھا،

اس زمانہ میں مسٹر محمد علی جینا کی سرکردگی میں مسلم لیگ نے "سوٹ ایبل گورنمنٹ" کی تجویز منظور کی تھی، مولانا اس قید کے سخت مخالف تھے، اس وقت مسلم لیگ پر ان کی جو نظمیں چھپیں اور جو ان کے اردو کلیات میں موجود ہیں، وہ اُن کے خیالات کی آئینہ دار ہیں، ان نظموں کو یہ مقبولیت حاصل تھی کہ جب ہفتہ اخبارات میں ان کی کوئی نظم شائع ہوتی تھی تو وہ بچہ بچہ کی زبان پر آجاتی تھی،

مسجد کانپور کے ہنگامہ میں ان کی نظموں نے مسلمانوں کے جذبات میں آگ لگادی تھی ع

ہم کشتگانِ معرکہ کان پور ہیں،

والی نظم تو ہندوستان کے اس سرے سے اُس سرے تک ایک ایک مسلمان بچہ کی زبان پر تھی،

سنہ ۱۹۱۲ء میں جو بڑا انقلاب انگیز سال تھا مسلمانوں کی آزاد اخبار نویسی کا سال آغاز ہے، جب لاہور سے زمیندار نے رنگ پلٹا اور کلکتہ میں الہلال نمودار ہوا تو وسط ہند کیسے خالی رہتا، چنانچہ لکھنؤ میں سید میسر جان کی کوشش اور مولانا کے زیر مشورہ مسلم گزٹ نکلا، مولانا اس میں کبھی نام سے اور کبھی بے نام مضمون لکھتے تھے، مولوی وحید الدین صاحب سلیم مرحوم کو اس کی اڈیٹری کے لئے مولانا ہی نے بلوایا تھا،

انگریزی ترجمۂ قرآن کی تجویز قریب قریب پوری ہو چکی تھی، نواب عماد الملک بلگرامی نے جو اپنے زمانہ کے بے نظیر انگریزی انشا پرداز تھے، مولانا کی تحریک سے پندرہ پارہ دن تک ترجمہ کر چکے تھے جو مطبوعہ مسودہ کی صورت میں اب بھی موجود ہے، پھر مولانا حمید الدین صاحب مرحوم جب دار العلوم حیدر آباد میں پرنسپل ہو کر گئے تو نواب صاحب نے ان کے

مشورہ و استصواب سے اپنے ترجمہ کے کئی پاروں پر نظر ثانی کی، مگر نواب صاحب کی وفات کے بعد جب میں نے یہ مسودہ نواب صاحب مرحوم کے خلف الرشید نواب مہدی یار جنگ بہادر وزیر سیاسیات و تعلیمات سرکار نظام سے منگوا بھیجا تو اس نظر ثانی شدہ مسودہ کا پتہ نہ چلا جس کا بہت افسوس ہے،

صفحہ ٦ پر ایک اہم تجویز کے نام سے ۱۱ر فروری ۱۹۱۴ء میں دار المصنفین کا تخیل پیش کیا تھا، وہ اس کی فکر میں تھے کہ اسی سال نومبر ۱۹۱۴ء میں انھوں نے وفات پائی، اس کے بعد اس تجویز کو عملی صورت میں جس طرح لایا گیا وہ آپ کے سامنے ہے،

ندوہ کی تعمیرات کی تجویزوں کے سلسلہ میں انھیں بڑی کامیابی ہوئی، ان کی تجویز کو پڑھ کر والی بہاولپور کی جدہ محترمہ مرحومہ نے پچاس ہزار روپیے یکمشت دیدیئے، دار الاقامہ کی تحریک کا یہ اثر ہوا کہ خود انھوں نے اور انکے متعدد دوستوں نے اپنے اپنے نام کے کمروں کے لئے ایک ایک ہزار دیے، جن سے ندوہ کے موجودہ بورڈنگ کے کچھ کمرے بنے ہونگے،

ندوہ کے فارغ شدہ طلبہ کی دستار بندی کا جلسہ جس کی تحریک ص ۹۴ پر درج ہے نہایت کامیابی سے ہوا، یہی جلسہ میری علمی کامیابیوں کا دیباچہ ہے، استاد نے خوش ہوکر اپنے سر سے پگڑی اتاری اور بھرے جلسہ میں شاگرد کے سر پر باندھی، واقعہ کی تفصیلات دار العلوم کی اس سال کی روداد میں درج ہیں،

قدیم عربی کتابوں کی اشاعت، کی جو تجویز انھوں نے ۱۸۹٦ء میں پیش کی تھی گو وہ اس وقت پوری نہیں ہوئی، لیکن عجیب بات ہے کہ جن قلمی کتابوں کی اشاعت کا نام انھوں نے لیا تھا ان میں سے ایک (مناقب شافعی للرازی) کے سوا سب کتابیں ان کی زندگی ہی میں چھپ گئیں اور وہ دائرۃ المعارف جس کے کام سے ان کو مایوسی تھی ان کے "حبیب صمیم" اور بانی کار کے

خلف الرشید اور ان کی درسگاہ کے چند تعلیم یافتوں کے ہاتھوں اس کی ایسی کایا پلٹ ہوئی کہ اس باب میں مولنا مرحوم کے اکثر ارادے پورے ہوگئے،

علم کلام کی مجلس خط وکتابت سے آگے نہیں بڑھی،

اس میں ایک مضمون المامون کی کسی تنقید کے جواب میں ہے، مولنا مرحوم کی عادت یہ تھی کہ ان کی کتابوں پر جو تنقیدیں لکھی جاتی تھیں، وہ ان کا جواب نہیں دیتے تھے۔ اخیر زمانہ میں جب "طالب علم کے نام سے ہمارے "فلسفی دوست" مولنا عبداللہ کی نہایت سخت تنقید الناظر میں مولانا کی تصنیف الکلام پر شائع ہوئی تو مجھے سخت غصہ آیا، اور اسی حالت میں میں مولنا کے پاس آیا، اور یہ سمجھا کہ جب میرا یہ حال ہے تو مولانا کا کیا حال ہوگا، مگر دیکھا کہ دریا کی سطح بالکل ساکن ہے، میں نے بڑے جوش سے جواب لکھنے کی تجویز کی تو میری ساری گرم گفتگو کا جواب اس مختصر سے ٹھنڈے فقرہ میں دیا، "جو وقت اس میں خرچ کیا جائے، اس میں کوئی اور نیا کام کیوں نہ کرلیا جائے"

اس کلیہ میں صرف ایک استثنا ہے اور وہ المامون پر ایک تنقید کا جواب ہے، تنقید اس نوجوان کے قلم سے نکلی تھی، جو اب نواب صدر یار جنگ بہادر کے خطاب سے مخاطب ہیں، مولانا کا جواب ۲۲ فروری ۱۸۸۹ء کے اخبار آزاد لکھنؤ میں شائع ہوا تھا، جس کے اڈیٹر شوق قدوائی مرحوم تھے، جواب کا لہجہ گو تلخ ہے، مگر یہ تلخی کیسی خوشگوار تھی کہ اسی تعلق سے ایک نے دوسرے کو پہچانا، اور اس کے بعد مولانا کی تصنیفات پر تقریظ و تنقید فاضل شروانی کے بدیع الاسلوب قلم کا دلچسپ کارنامہ بن گئی،

یہ مضامین جو متفرق اخباروں اور رسالوں سے بمشکل جمع کئے گئے ہیں، حق یہ ہے کہ اس مشکل کام کی انجام دہی کا سہرا مولانا کے ایک معتقد ندوی مولوی معین الدین صاحب

قدوائی (بارہ بنکی) کے سر ہے، اب اتنے دنوں میں وہ کچھ سے کچھ ہو گئے، اور زمینداری کے کاروبار نے اس مذاق سے ان کو دور کردیا ہے، مگر ان کا یہ کام یادگار رہے گا،

سید سلیمان ندوی

۶ر رمضان المبارک ۱۳۵۷ھ

۳۱ر اکتوبر ۱۹۳۸ء

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مذہبی

صیغہ اشاعت اسلام

اشاعت اسلام کی اہمیت کا احساس تمام ہندوستان کے مسلمانوں کو ہو گیا ہے، لیکن چونکہ اس کی وجوہ ضرورت، اور تدابیر کا پورا خاکہ مرتب نہیں کیا گیا، اس لئے اسکے متعلق جو کوششیں ہو رہی ہیں صاف نظر آتا ہے کہ ناتمام اور ناکافی ہیں، ہم کو اس مسئلہ کے طے کرنے کے لئے امور ذیل کو پیش نظر رکھنا چاہیئے،

۱۔ اشاعت اسلام کی ضرورت،

۲۔ کامیابی کی تدبیریں،

اشاعت اسلام کے لفظ سے اگرچہ غیر مذہب والوں کا اسلام میں لانا متبادر ہوتا ہے، لیکن اس وقت ہماری مراد اس سے حفاظت اسلام ہے یعنی مسلمانوں کا اسلام، اور احکام اسلام پر قائم رکھنا، یہ ظاہر ہے کہ ہزاروں لاکھوں مسلمان جو دیہات میں رہتے ہیں احکام اسلام سے ناواقف ہوتے ہیں، اس لئے آریہ وغیرہ ان کے مرتد کرنے کی کوشش کرتے ہیں، نئی نسلیں جو بچپن ہی سے انگریزی تعلیم میں مصروف ہو جاتی ہیں، وہ بھی اکثر اسلام سے ناواقف ہوتی ہیں، اس لئے انگریزی تعلیم ان کے عقائد کو متزلزل کر دیتی ہے انہی دونوں گروہوں کے اسلام کی حفاظت کرنا اشاعت اسلام کا اصلی کام ہے، اسکی تدبیریں حسب ذیل ہیں،

۱۔ ہر ضلع میں ایک یا دو مولوی مقرر کئے جائیں جو دیہات میں جا کر اور دس دس پانچ پانچ (جیسی کہ ضرورت ہو) روز قیام کر کے اسلام کے عقائد اور احکام سکھائیں، اور ممکن ہو تو مکتب قائم کرائیں،

۲۔ ہر شہر میں ایک عالم مقرر کیا جائے جو انگریزی خواں طلبہ کو ہفتہ میں ایک دن دینیات پڑھائے جس کا یا تو یہ طریقہ ہے کہ سرکاری اسکولوں میں اس کا انتظام کرایا جائے یا خود اس عالم کے مکان پر طلبہ جمع ہوں، اور طلبہ کے مربیوں سے اس انتظام میں مدد لیجائے اس انتظام کے لئے ضرور ہوگا کہ ان طلبہ کی حالت کے مواقف، دینیات کا نصاب تعلیم تیار کیا جائے،

۳۔ ایک جماعت آریوں سے مناظرہ اور مباحثہ کرنے کے لئے تیار کی جائے، جو بھاشا اور سنسکرت سے واقف ہو،

۴۔ آریوں کے مہمات عقائد کے رد میں چھوٹے چھوٹے رسالے شائع کئے جائیں، جو بخلاف موجودہ رسالوں کے نہایت تہذیب اور متانت کے ساتھ لکھے گئے ہوں،

(۵) اشاعت اسلام کی شاخیں ہر ضلع میں قائم کی جائیں، نہایت کثرت سے لوگ ممبر بنائے جائیں، چندہ ممبری کی تعداد (۶) سالانہ ہو، اور بذریعہ ویلو پی ایبل کے وصول کیا جائے،

۶۔ اشاعت اسلام کا سکریٹری اور اس کے سفرا اور واعظین اور مقامی شاخوں کے عہدہ دار سب کے لئے لازمی ہوگا کہ وہ نذر و نیاز لینے کا طریقہ نہ رکھتے ہوں، ورنہ ان کے ذریعہ سے فراہمی چندہ وغیرہ میں یکسو کارروائی نہ ہو سکے گی،

۷۔ اس مختصر طریقہ کارروائی کو مع تمہید کے ہزاروں لاکھوں کی تعداد میں شائع کیا جائے اور کارروائی شروع کر دی جائے،

(قلمی) جولائی ۱۹۱۶ء

نومسلم راجپوت

اور

حفاظتِ اسلام

آریوں کی مذہبی دست درازیوں نے جس قدر ضرر پہنچایا، اس سے زیادہ فائدہ حاصل ہوا، بے شبہ ان کے اغوا، اور فریب کاری سے چند بچے نومسلم، مرتد ہوکر اسلام کے دائرہ سے نکل گئے، لیکن اس واقعہ نے ہندوستان میں اس سرے سے اُس سرے تک ایک آگ سی لگا دی، اور ہر طبقہ اور ہر درجہ کے مسلمان دفعۃً چونک پڑے، مسلمانوں کا وہ گروہ جو دنیوی تعلیم کی مصروفیت کی وجہ سے مذہبی تعلیم سے بالکل غافل ہو گیا تھا، یہاں تک کہ بعض بعض علانیہ مذہب کی توہین کرنے لگے تھے، وہ بھی گھبرا اٹھے اور بدحواس ہیں، کہ مذہب ایک طرف مسلمانوں کی مردم شماری جس پر ملکی حقوق کی بنیاد ہے، گھٹتی جاتی ہے، اس کا کیا علاج ہوگا!!

بے شبہہ قوم کا یہ مذہبی احساس ہماری خوش نصیبی کی فال ہے لیکن اس واقعہ کی تہ میں جو نہایت اہم نتائج پوشیدہ ہیں، ہم کو ان پر نظر ڈالنی چاہئیے،

سب سے پہلے ہم کو اس پر غور کرنا چاہئیے کہ ان نومسلموں کے مرتد ہو جانے کا سبب کیا ہوا، اس کا جواب صرف ایک ہے، وہ یہ کہ یہ لوگ اسلامی عقائد، اسلامی احکام، اسلامی تاریخ

سے بالکل نا واقف تھے، ان کا اسلام صرف نام کا اسلام تھا، اس لئے ذرا سی فریب کاری اور دھوکہ سے یہ عارضی رنگ اڑ گیا، یہ جواب بے شبہ صحیح اور سرتاپا صحیح ہے لیکن سوال یہ ہے، کہ ہماری موجودہ دنیوی تعلیم سے کیا اس پیشین گوئی کی مخفی آواز نہیں آ رہی ہے ؟

کیا ہماری دنیوی تعلیم (انگریزی تعلیم) میں عقائد اسلام کے استحفاظ کا کوئی بندوبست ہے؟ کیا اس میں تاریخ اسلام کا کوئی معتدبہ حصہ شامل ہے، ؟ کیا وہ مذہبی زندگی کی ذمہ دار ہے؟

بے شبہ ابھی تک موجودہ نسلوں میں اسلام کی آثارات نظر آتے ہیں، لیکن یہ پچھلے اور موجودہ سوسائٹی کی بقیہ یادگاریں ہیں،

کچھ زیادہ دن نہیں گذرے کہ اخباروں میں یہ مضامین مسلمان لیڈروں کی طرف سے شائع ہوتے تھے کہ اسلام کا قانون وراثت بدلنے کے قابل ہے، ایک مسلمان صاحب نے علانیہ لکھا تھا کہ **قرآن** کی وہ سورتیں جو **مدینہ** میں اتریں بادشاہانہ حیثیت رکھتی ہیں انکو مذہب سے کچھ تعلق نہیں،

بے شبہ ابھی اس قسم کی مثالیں کم ہیں لیکن ابھی دنیوی تعلیم کو پھیلے ہوئے کے دن ہوئے ہیں ؟ نومسلم راجپوت، دوسو برس کے بعد اس حالت کو پہنچے ہیں، جدید تعلیم کی جو رفتار ہے دوسو برس کے بعد اس سے کس قسم کے نتیجہ کی توقع ہوسکتی ہے ؟

اس تقریر سے ہمارا یہ مطلب نہیں کہ دنیوی تعلیم کو روکا جائے، ہمارے نزدیک دنیوی تعلیم کو اس قدر پھیلانا چاہئے کہ بچہ بچہ تعلیم یافتہ ہو جائے، لیکن ساتھ ہی ہم کو **مذہب** کی حفاظت پر بھی اپنی تمام قوت صرف کر دینی چاہئے، اس کی تدبیر اس کے سوا اور کیا ہوسکتی ہے کہ **مذہبی تعلیم** کی ایک وسیع الشان **درسگاہ** موجود ہو جس میں تمام مذہبی علوم نہایت تکمیل، اور اہتمام کے ساتھ پڑھائے جائیں، طلبہ کو عمدہ تربیت دی جائے، وہ

دریوزہ گری کے طریقہ سے بچائے جائیں، ان کو ایثارِ نفس اور سچی قناعت و خودداری کی تعلیم دلائی جائے،

یہی صدا ہے جو ندوۃ العلما نے بار بار بلند کی، اور جس کو سبک مغزوں نے اس شور و غل کے ہنگامہ سے دبا دینا چاہا کہ "ہمکو آج عربی تعلیم کی کوئی ضرورت نہیں"۔

دوسرا امر قابلِ غور یہ ہے کہ آریوں کی دست درازی کو روکنے کا جو طریقہ اختیار کیا گیا ہے، وہ کہاں تک ٹھیک ہے، موجودہ حالت یہ ہے کہ ہر انجمن نے اپنے اپنے واعظ اور مولوی مقرر کر کے مختلف مقامات پر بھیج دیئے ہیں، اگرچہ یہ مذہبی بے چینی اور مذہبی جوش کا ثبوت ہے لیکن اس موقع پر قوتوں کا متفرق کرنا بالکل نامناسب ہے، ایک عام انجمن حفاظت یا اشاعتِ اسلام کے نام سے قائم ہونی چاہیئے، اور تمام لوگوں کو اسی کا معاون اور شریک ہونا چاہیئے، ندوۃ العلما نے آغاز میں اشاعتِ اسلام کا ایک صیغہ قائم کیا تھا، لیکن چونکہ مختلف کام ایک وقت میں انجام نہیں پا سکتے تھے اس نے اپنی توجہ تمامتر مذہبی تعلیم کی طرف مصروف کی، اور اشاعتِ اسلام کے صیغہ کو ملتوی کر دیا، مولوی عبدالحق صاحب حقانی دہلوی نے ایک انجمن ہدایت الاسلام کے نام سے قائم کی، آگرہ میں جو مشہور جلسہ آریوں کے مقابلہ میں ہوا، اور جس نے نومسلموں کو برگشتگی سے روک لیا، اس میں بڑا حصہ اسی انجمن کا تھا، ندوۃ العلماء نے بھی اپنا ایک عالم سفیر اس جلسہ میں بھیجا تھا،

بہر حال مناسب یہ ہے کہ تمام لوگوں کو متفقہ انجمن ہدایت الاسلام کو وسعت دینی چاہیئے، اور اسی کو اس کام کا اصلی مرکز قرار دینا چاہیئے، الگ الگ اور علحدہ علحدہ کام کرنے سے قوتیں پراگندہ ہوں گی، اور اس بدگمانی کا موقع ہوگا کہ لوگوں کو اخلاص

مقصود نہیں، بلکہ اس موقع سے فائدہ اٹھانا اور قوم کی کشش کو اپنی طرف مائل کرنا مقصود ہے
ندوہ نہایت خوشی سے منظور کریگا، کہ اس انجمن کو ہر قسم کی مالی اور قلمی اعانت دے یہ بالکل
ممکن تھا کہ ندوہ بھی خود اس کام کو چھیڑ دے لیکن چونکہ ایک ہی وقت میں مختلف کوششیں شروع
ہوگئی ہیں، اس لئے ندوہ یہ چاہتا ہے کہ تمام قوم مل کر ایک متحد مرکز قرار دے وہ ہدایت الاسلام
ہو یا اشاعت اسلام یا اور کوئی، یہ ہما ہمی اور خود پرستی اور نمود و نام کا موقع نہیں ہے، جو
کام ہونا چاہئے بے لاگ خلوص اور سچائی کے ساتھ ہونا چاہئے،

(ندوہ لکھنؤ، ۱۳ راپریل ۱۹۰۸ء)

(قلمی)

حفاظت و اشاعتِ اسلام

حفاظت و اشاعتِ اسلام کے متعلق جو سادہ اور مختصر خاکہ چھپوا کر بزرگانِ قوم کی خدمت میں ارسال کیا گیا، اکثر صاحبوں نے اس سے اتفاق ظاہر کیا، اور ہر قسم کی شرکت کی آمادگی ظاہر فرمائی، ان میں سے بزرگانِ ذیل کا نام خصوصیت کے ساتھ قابلِ ذکر ہے، جناب حکیم اجمل خاں صاحب، جناب ڈاکٹر اقبال صاحب، جناب نواب صدر الدین خاں صاحب رئیس بڑودہ، جناب مولوی حبیب الرحمن خاں صاحب شروانی، جناب مولوی محمد دین صاحب ڈائرکٹر تعلیمات ریاست بہاولپور، جناب نواب احمد سعید خانصاحب رئیس دہلی، جناب بابو نظام الدین صاحب رئیس امرت سر،

لیکن وہ مسودہ نہایت مختصر اور مجمل تھا، اس لئے ضرور ہے کہ جو کچھ نصب العین ہو، اس کا پورا خاکہ ایک دفعہ پیشِ نظر کر دیا جائے، یہ صاف نظر آرہا ہے کہ اسلام پر نہایت سخت خطرات محیط ہوتے جاتے ہیں، ایک طرف آریوں کی پرزور تدبیریں تمام نو مسلم گاؤں میں آریہ واعظوں کی مستقل سلسلہ جنبانیاں، گروکل کی حیرت انگیز تیاریاں، مشنریوں کی وسعتِ عمل، ملاحدۂ یورپ کے حملے مغربی خیالات کا اثر،

ان کے مقابلہ میں مسلمانوں کی سرد مہری، مذہبی تعلیم کی کمی، قوتوں کی پراگندگی، طرزِ عمل کی بے قاعدگی، سرمایہ کی بے استقلالی، دونوں حالتوں کو سامنے رکھکر دیکھئے، کن

نتائج کی توقع ہوسکتی ہے،

مذہبی ضروریات کا انتظام مذہبی ضروریات بہت سی وہ ہیں جو پہلے سے موجود ہیں، اور جن کے متعلق ملک میں پہلے سے ہر قسم کی تدبیریں جاری ہیں، مثلاً عربی مدارس، مساجد، واعظین وغیرہ وغیرہ، ان چیزوں میں بہ شکل موجودہ ہاتھ ڈالنے کی ضرورت نہیں، ہمارا دائرہ عمل وہ ضروریات مذہبی ہیں جو زمانہ حال نے پیدا کر دی ہیں، اور جن کا انتظام اور بندوبست اس قدر ضروری ہے کہ اگر جلد تر اس کا صحیح اور مضبوط اور منتظم طریقہ نہ اختیار کیا جائیگا، تو اسلام کو سخت صدمہ پہونچے گا، اور پھر اس کی کچھ تلافی نہ ہوسکے گی' یہ ضروریات حسب ذیل عنوانوں میں تقسیم کیجا سکتی ہیں،

(۱) وہ ضرورتیں جن کا تعلق گورنمنٹ سے ہے،

(۲) وہ ضرورتیں جن کا تعلق مخالفین اسلام سے ہے، جو کہ مسلمانوں کو عیسائی یا آریہ وغیرہ بنانا چاہتے ہیں، اور جو ہماری غفلت کی وجہ سے کامیاب ہوتے جاتے ہیں،

(۳) وہ ضرورتیں جن کا تعلق خود مسلمانوں سے ہے،

جو ضرورتیں گورنمنٹ سے متعلق ہیں، انگریزی گورنمنٹ کو تمام گورنمنٹوں پر اس بارہ میں فوقیت حاصل ہے کہ اس نے رعایا کو تمام مذہبی امور میں آزادی دی ہے، اور کسی مذہب کے اصول اور مسائل میں دست اندازی نہیں کرتی،

لیکن بعض موقع ایسے پیش آتے ہیں، کہ گورنمنٹ کو کسی فرقہ کے مذہبی مسئلہ کا صحیح علم نہیں ہوتا، اس صورت میں جب وہ فرقہ گورنمنٹ کو مطلع کرتا ہے، تو گورنمنٹ اس کے مطابق اصلاح کر دیتی ہے، مثلاً وقف اولاد کے متعلق حکام پریوی کونسل نے متعدد فیصلے نافذ کر دیئے تھے، کہ قانون اسلام کی رو سے محض اولاد پر وقف کرنا صحیح نہیں، پریوی کونسل کے فیصلے

گویا ناقابل منسوخی ہوتے ہیں، لیکن جب تمام مسلمانانِ ہندوستان نے ملکر یہ آواز بلند کی، کہ یہ ان کے مذہب کی غلط تعبیر ہے، اور گورنمنٹ کو یقین ہو گیا کہ یہ تمام مسلمانوں کی متفقہ آواز ہے تو وہ اس کی اصلاح پر آمادہ ہو گئی، اور کونسل میں اس کا جو مسودہ پیش ہوا سکریٹری آف اسٹیٹ نے اس کو اصولاً تسلیم کر لیا،

اس قسم کے اور بہت سے امور ہیں، مثلاً ہندوستان میں مذہبی اوقاف کی تعداد کروڑوں روپیہ تک پہونچتی ہے، لیکن ان میں سے اکثر بے مصرف صرف ہو رہے ہیں، اور ہر سال لاکھوں روپیہ برباد جاتا ہے، اگر ان اوقاف کا باقاعدہ انتظام ہو جائے تو ہر قسم کی مذہبی ضروریات بغیر کسی نئی کوشش اور چندہ کے انجام پا جائیں،

مسلم لیگ وغیرہ نے گورنمنٹ کو اس طرف متوجہ کیا لیکن گورنمنٹ نے جواب دیا کہ یہ ثابت ہونا چاہیئے کہ یہ تمام مسلمانوں کی خواہش ہے، اسی طرح ہائی کورٹوں میں پہلے یہ طریقہ تھا کہ ایک مفتی بھی مقرر ہوتا تھا، اور مقدمات میں اس کا فتوی لے کر حکام فیصلہ کرتے تھے، اب یہ قاعدہ نہیں رہا، اور اس لئے بہت سے مقدمات میں فقہ کی غلط تعبیر ہو جاتی ہے، بیرسٹر اور وکلار فقہ سے اکثر ناواقف ہوتے ہیں اور اس لئے اس قسم کی غلطیوں کی تلافی نہیں ہو سکتی،

غرض اس قسم کی بہت سی مذہبی ضرورتیں ہیں جن کو معقول طریقہ سے گورنمنٹ میں پیش کرنے کی ضرورت پیش آتی رہتی ہے، لیکن اس کے لئے ضروری ہے کہ گورنمنٹ کو یہ یقین ہو کہ یہ تمام مسلمانوں کی متفقہ آواز ہے، اور یہ ایسی صورت میں ہو سکتا ہے کہ ایک عام انجمن قائم کیجائے جسمیں مسلمانوں کے تمام فرقوں کے لوگ شامل ہوں،

مخالفینِ اسلام کے مقابلہ میں مذہبی ضرورت،

اب یہ کوئی مخفی راز نہیں رہا کہ آریوں اور عیسائیوں نے ہمارے مذہب پر علانیہ حملہ شروع کر دیا ہے، اور ان کی باقاعدہ اور مسلسل اور متواتر

کوششیں ہر روز کامیاب ہوتی جاتی ہیں، ممالک متحدہ کی اس سال کی مردم شماری سے واضح ہوتا ہے کہ ۱۸۸۱ء میں عیسائیوں کی تعداد بہ مقابلہ آبادی کے ۳ فی ہزار تھی، لیکن اب ۲۹ فی ہزار ہے، آریوں کی تعداد ۱۸۹۱ء میں فی دس ہزار پانچ تھی، لیکن اب فی دس ہزار ۲۸ ہے اس تعداد میں خود ہندؤں سے بھی اضافہ ہوتا ہے لیکن یہ قطعی اور چشم دید واقعہ ہے کہ ہزاروں مسلمان عیسائیت اور آریہ کا شکار ہو چکے ہیں اور ہوتے جاتے ہیں،

مسلمانوں نے جو کوششیں اب تک آریوں اور عیسائیوں کے مقابلہ میں کی ہیں آپ دیکھ رہے ہیں، کہ وہ پراگندہ، غیر منتظم، اور ناکافی ہیں، اس لئے مخالفین کی کوششوں کے سیلاب کو روک نہیں سکتیں،

ان حملوں کے مقابلہ میں ہمکو دو قسم کی کوششوں کی ضرورت ہے،

مدافعت | یعنی جاہل اور ناواقف مسلمانوں کو مخالفین کی دستبرد سے محفوظ رکھنا، اور اس غرض سے ان میں ابتدائی مذہبی تعلیم پھیلانا،

اشاعت، | ہمارے لئے صرف یہی کافی نہیں کہ ہم سپر بن کر صرف دوسروں کے حملہ سے اپنے آپ کو بچائیں، اسلام اس لئے آیا تھا کہ تمام دنیا پر اپنے آپ کو پیش کرے، اس لئے ضرور ہے کہ ہم دوسری قوموں میں اپنے واعظ اور داعی بھیجیں جو اسلام کی تبلیغ کریں، یہ قطعی ہے کہ اگر صحیح طور سے مذہب اسلام دنیا کی قوموں کے سامنے پیش کیا جائے تو ہزاروں لاکھوں اشخاص نہ صرف ایشیا بلکہ یورپ میں بھی اسلام کو بے تکلف قبول کر سکتے ہیں،

مدافعت کا انتظام، | پہلی ضرورت یعنی مدافعت کے لئے ہم کو ایک مختصر نصاب جس کی مدت تحصیل ۲ برس سے زیادہ نہ ہو مرتب کرنا چاہئے، تاکہ چھوٹی چھوٹی تنخواہوں کے مدرس اس غرض سے ہات آسکیں کہ نومسلموں اور جاہل مسلمانوں کی آبادیوں میں جا کر انکو ابتدائی

مذہبی اور عام تعلیم دے سکیں، علمار دیہات میں معمولی تنخواہوں پر قیام نہیں کر سکتے اور معمولی خواندہ لوگ مذہبی تعلیم نہیں دے سکتے،

اشاعت کا انتظام | جب تک ایسے علمار تیار نہ ہوں جو انگریزی زبان اور علوم سے بھی واقف ہوں جس کی بنیاد ندوۃ العلمار نے ڈال دی ہے، اس وقت تک بغیر اس کے کوئی چارہ نہیں کہ قابل انگریزی دانوں کو بیش قرار وظائف دیکر دو برس تک مذہبی تعلیم دیجائے اور پھر ان سے یہ کام لیا جائے کہ وہ ملکی زبان کے علاوہ انگریزی زبان میں بھی اسلام کی صداقت اور حقیقت پر تقریریں کر سکیں، اور لوگوں کو اسلام کا پیغام پہونچائیں،

اندرونی ضروریات مذہبی کا انتظام | مسلمانوں کے ہزاروں لاکھوں بچے انگریزی تعلیم میں مصروف ہیں، اور یہ تعداد روز بروز بڑھتی جائیگی، یہ لڑکے اکثر ان مدارس میں تعلیم پاتے ہیں، جہاں مذہبی تعلیم کا انتظام نہیں ہے، مذہبی تعلیم کے لئے گورنمنٹ سرکاری مدارس میں ایک آدھ گھنٹہ دے سکتی ہو لیکن اس کا ہر قسم کا انتظام مسلمانوں کو خود کرنا ہوگا اس کام میں جو سب سے زیادہ دقت پیش ہو وہ یہ ہو کہ اردو زبان میں دینیات کی تعلیم کا کوئی مختصر دلچسپ اور جامع نصاب موجود نہیں ہے اس لئے سب سے مقدم یہ ہے کہ خود نصاب کے عنوان اور ترتیب کا خاکہ قائم کرکے اشتہار دیا جائے، اور معقول انعامات مقرر کئے جائیں، اور ایک کمیٹی انتخاب کے لئے قائم کیجائے، اس طریقہ سے امید ہے کہ ایک عمدہ اور دلچسپ نصاب تیار ہو جائے، یہ نصاب نہ صرف انگریزی مدارس کے لئے بلکہ دیہات کے ابتدائی مدرسوں کے لئے بھی کام آئیگا،

ایک عام انجمن اور اسکی شاخوں کی ضرورت | لیکن یہ تمام کام جنمیں سے ہر ایک نہایت اہم ہے کسی خاص مقامی اور خصوصی انجمن سے انجام نہیں پاسکتے، ضروری ہے کہ تمام ہندوستان کی ایک مشترکہ انجمن قائم کیجائے جسمیں ہر طبقہ اور ہر درجہ کے لوگ شریک ہوں، اور جس کی شاخیں تمام ہندوستان

میں قائم کی جائیں،

انجمن کا نظام | اس طرح قائم کیا جائے کہ ایک کونسل ہو جس کے ۲۵ ممبر ہوں اور ہر صوبہ سے پانچ پانچ ممبر لئے جائیں چار یا پانچ مستقل سکریٹری ہوں یعنی ہر صیغہ کا الگ سکریٹری ہو، سو انتظامی ممبر ہوں اور وہ بھی ہر صوبہ کی مناسبت سے لئے جائیں، کونسل اور انتظامی ممبروں کا انتخاب پبلک اور انتخابی اصول پر ہو، ان کے علاوہ عام ممبر ہوں جن کی تعداد محدود نہ ہو، اور جن کے لئے صرف اس قدر ضروری ہو کہ سالانہ عہ چندہ ادا کرسکیں، اور یہ تعداد اس قدر وسیع ہو کہ ابتدائی زمانہ میں کم از کم ایک لاکھ ممبر بہم پہونچ جائیں،

کونسل کے قواعد، | کونسل کا ذکر نہایت مختصر طور پر کیا گیا ہے، اس کے لئے ایک مرتب دستور العمل بنانے کی ضرورت ہے، اور اہل الرائے حضرات سے خاص طور پر درخواست ہے کہ وہ اس کا مسودہ مرتب کرنے کی تکلیف گوارا فرمائیں،

نیز اس سے بھی مطلع فرمائیں کہ آپ کے نزدیک کونسل اور مجلس انتظامی کی ممبری کے لئے کون حضرات سب سے زیادہ موزوں ہوسکتے ہیں،

پالٹکس سے علحدگی | اس انجمن کو کسی حالت میں پالٹیکس سے کچھ سروکار نہ ہوگا،

(مطبوعہ)

نومسلموں کو دوبارہ ہندو ہو جانے سے بچانے

کیلئے

تمام برادرانِ اسلام کی خدمت میں فریاد

اے برادرانِ اسلام! کبھی کبھی آپ کے کانوں میں بھنک پڑتی ہے کہ فلاں گاؤں میں مخالفوں نے نومسلموں کو آریہ بنا لیا، آپ اسکو اتفاقی اور شاذ و واقعہ سمجھتے ہیں، لیکن واقعی حالت یہ ہے کہ خاموشی کے ساتھ اس قسم کی کوشش کا ایک مسلسل، باضابطہ اور عالمگیر سلسلہ جاری ہے، جس کے نتائج اسلام کے حق میں نہایت خطرناک نظر آتے ہیں، اس کوشش کی کامیابی اس وجہ سے زیادہ آسان معلوم ہوتی ہے، کہ ہزاروں دیہات اور مواضع اس قسم کے ہیں جہاں کے نومسلم اسلام سے اس قدر بے خبر ہیں کہ ان کے نام لچھمن سنگھ اور دیال سنگھ ہوتے ہیں، انھوں نے عمر بھر کبھی کلمہ کا لفظ نہیں سنا، ان کے گاؤں میں اگر کوئی مسجد ہے تو اس میں کبھی نماز نہیں ہوتی، البتہ گوبر سے کبھی کبھی اسکی لپائی کر دی جاتی ہے، اس قسم کے دیہات راجپوتانہ، بیکانیر، الور، بھرت پور، حصار اور سلطان پور وغیرہ میں کثرت سے پائے جاتے ہیں،

میں نے اس امر کی تحقیق کے لئے اخباروں میں اشتہار دیا، تو نہایت کثرت سے ان مقامات کے رہنے والوں کے خطوط آئے، اور انھوں نے تفصیل کے ساتھ واقعات لکھے،

یہ نومسلم اکثر راجپوت ہیں، وہ مسلمانوں کے ہاتھ کا کھانا نہیں کھاتے، ان کی تمام رسمیں

طور اور طریقہ ہندوؤں کے ہیں وہ صرف اس علامت سے مسلمان خیال کئے جاتے ہیں کہ مردوں کو دفن کرتے ہیں، آگ میں نہیں جلاتے، اور جب ان سے پوچھا جاتا ہے، تو اپنے آپ کو مسلمان کہتے ہیں،

آریوں کے واعظ اور سفیر ان دیہاتوں میں جاتے ہیں، اور ان سے کہتے ہیں "تمھارے باپ دادا کو مسلمان بادشاہوں نے جبراً مسلمان بنایا تھا، اب تم یہ ننگ کیوں گوارا کرتے ہو" یہ جادو ان پر آسانی سے چل جاتا ہے، اور وہ ہندو ہو جاتے ہیں،

اس حالت کا قوم کو احساس ہوا، اور جا بجا انجمنیں قائم ہوئیں لیکن انھوں نے جو واعظ مقرر کئے وہ صرف شہروں میں دورہ کرتے ہیں، وعظ کہتے ہیں، آریوں سے مناظرہ کا اعلان دیتے ہیں، دیہات میں وہ اس لئے نہیں جا سکتے کہ دیہات میں جانے اور رہنے کی سختیاں وہ برداشت کرنے کے عادی نہیں، اگرچہ مناظرہ بھی خالی از فائدہ نہیں لیکن یہ ظاہر ہے کہ یہ تدبیر مرض کا اصلی علاج نہیں، یہ کام اس قدر وقت طلب ہے کہ ایک یا دو شخص کی رائے اس عقدہ کے حل کرنے کے لئے کافی نہیں، اس لئے ضرور ہے کہ اکثر مقامات سے صاحب تجربہ اور اہل الرائے اور واقف کار حضرات ایک مقام پر جمع ہوں، اور آپس میں مشورہ اور غور و مبادلۂ خیالات کے بعد ایک مفصل خاکہ تیار کریں، جس کے موافق باقاعدہ اور وسیع کارروائی شروع کیجائے، اس کے لئے یہ مناسب موقع ہے کہ ۶ اپریل ۱۹۱۲ء سے ۸ اپریل تک ندوۃ العلما کا سالانہ اجلاس بمقام لکھنؤ منعقد ہو گا، جن حضرات کے دل میں اسلام کا درد ہے وہ اس موقع پر تشریف لائیں،

جو تدبیریں اس وقت خیال میں آتی ہیں وہ اس غرض سے پیش کیجاتی ہیں، کہ تمام حضرات کو ان پر غور اور فکر کا موقع ملے، وہ تدبیریں حسب ذیل ہیں،

(۱) اس قسم کے واعظ مقرر کئے جائیں جو دو دو چار چار مہینے ایک ایک گاؤں میں رکھ

لوگوں کو اسلام کے احکام سکھائیں، اس قسم کے واعظوں کے تیار کرنے کا خاص انتظام ہونا چاہئے،

(۲) دو دو چار چار گانوں کے بیچ میں ابتدائی مدرسے قائم کئے جائیں، جنمیں قرآن شریف اور اردو کی تعلیم دیجائے،

(۳) صوفی وضع لوگ بھیجے جائیں جن کا اثر عوام پر خود بخود پڑتا ہے،

(۴) مسلمانوں کے دیہات میں جو سرکاری ابتدائی مدرسے ہیں کوشش کیجائے، کہ ان کے مدرسین مسلمان مقرر ہوں، اب تک اکثر ہندو مدرس مقرر ہوتے ہیں اور اس لئے بچوں کو اسلام کی طرف رغبت نہیں ہوسکتی، غرض یہ ایک نہایت اہم مذہبی اور قومی مسئلہ ہے، اس کو نہایت غور و فکر اور جد و جہد سے حل کرنا چاہئے، اگر مسلمان ایسے خطرہ کی پرواہ نہیں کرتے، تو ان کو اسلام کا نام نہیں لینا چاہئے،

مسلم گزٹ لکھنؤ

۱۱ مارچ ۱۹۱۲ء

کارروائی

انجمن وقف علی الاولاد

(زیر حمایت ندوۃ العلماء)

مسلمانوں کی فقہ کا یہ ایک مسلّم مسئلہ ہے کہ اگر کوئی شخص اپنی جائداد کو اپنی اولاد پر وقف کر دے جس کی غرض یہ ہو کہ اصل جائداد ہمیشہ محفوظ رہے، اور اس کے منافع سے اولاد ہمیشہ متمتع ہوتی رہے، تو یہ وقف شرعاً جائز اور صحیح ہوگا، یعنی اس جائداد کو کبھی کوئی شخص فروخت اور منتقل اور ضائع نہیں کر سکے گا، اور اس کے منافع سے اس شخص کی اولاد کا سلسلہ جب تک دنیا میں قائم رہے، متمتع ہوتا رہے گا،

یہ طریقہ اسلام میں ہمیشہ جاری رہا، اور تمام بلاد اسلامیہ میں اب تک جاری ہے اور ہندوستان میں بھی ایک مدت تک جاری رہا، لیکن بعض خاندانوں میں نزاع پیدا ہونے پر اس کے متعلق سرکاری عدالتوں میں مقدمات دائر ہوئے اور پریوی کونسل سے یہ فیصلہ ہو گیا کہ ایسا وقف ناجائز ہے، پریوی کونسل کا استدلال یہ ہے کہ وقف خیرات کرنے کا نام ہے اور اپنی اولاد کو دینا خیرات میں داخل نہیں ہو سکتا، (حالانکہ شریعت اسلام میں سب سے بہتر خیرات یہی ہے، کہ اپنے عزیز و اقارب کو دیا جائے)

اس فیصلے کے بعد سرکاری طور سے اس قسم کے تمام اوقاف باطل ہو گئے، اور یہ نقصان

عالمگیر ہوتا جاتا ہے،

چونکہ گورنمنٹ انگریزی کا یہ پہلا اصول ہے کہ کسی کے مذہبی احکام میں مداخلت نہ کرے اس لئے یہ قطعی اور یقینی ہے کہ اگر گورنمنٹ کو یقین ہو جائے کہ یہ مسلمانوں کا مسلمۂ مذہبی مسئلہ ہے تو گورنمنٹ ضرور اس فیصلہ کی اصلاح پر مائل ہوگی، لیکن جو کارروائیاں اس کے متعلق بعض بعض قوم کے بزرگوں نے کیں، اس نے گورنمنٹ کو اس پر یقین نہیں دلایا، مولوی امیر علی صاحب نے ایک مقدمہ وقف دمیر محمد اسمٰعیل خاں بنام منشی چرن گھوش) میں اس مسئلہ کے جواز کے تمام دلائل لکھے تھے، لیکن حکام پریوی کونسل نے بہ مقدمہ ابو الفتح بنام راس مایا دھر چودھری مندرجہ جلد ۲۲ ترجمۂ انڈین لا رپورٹ مطبوعہ جولائی ۱۸۹۵ء، ان دلائل کو ناکافی خیال کیا،

اس کے بعد مولوی محمد یوسف صاحب وکیل کلکتہ نے ایک نہایت مفصل رسالہ اس کے متعلق لکھا اور بہ حیثیت پریسیڈنٹ محمڈن ایسوسی ایشن بنگال، جناب گورنر جنرل بہادر کی خدمت میں بھیجا، لیکن جناب موصوف نے مارچ ۱۹۰۸ء میں ان کو یہ جواب لکھا کہ پریوی کونسل کے فیصلہ میں کوئی مداخلت نہیں ہو سکتی،

اب چند امر قابل غور پیدا ہوئے،

(۱) آیا یہ مسئلہ حقیقت میں مسلمانوں کا مذہبی مسلمہ مسئلہ ہے یا نہیں؟

(۲) اگر ہے تو گورنمنٹ کو کیونکر اس کا یقین دلایا جا سکتا ہے؟

(۳) گورنمنٹ پریوی کونسل کے فیصلہ میں مداخلت کر سکتی ہے یا نہیں؟

چونکہ دفعہ اول میں کچھ شبہہ نہ تھا، اس لئے دفعہ دوم اور سوم کے متعلق میں نے قوم کے اُن اکابر سے جو امور قانونی اور ملکی معاملات میں سب سے بہتر رائے دے سکتے ہیں، خط و کتابت کی، سب نے متفقاً کامیابی کی امید ظاہر کی، اور خواہش کی کہ صحیح طریقہ سے اس تحریک کو جاری کیا جائے

چنانچہ ان میں سے بعض خطوط کا اقتباس حسب ذیل ہے،

سید علی امام صاحب بیرسٹرایٹ لا پریسیڈنٹ مسلم لیگ، ضرور اس امر وقف میں ہم مسلمانوں کو پوری اور کامل کوشش کرنی چاہیئے کہ فیصلۂ پریوی کونسل خلاف قانون اسلام قرار دیا جائے میں مشورہ اور کسی قدر چندہ سے بھی خدمت کر سکتا ہوں، فروری ۱۹۰۸ء

ہم مسلمانوں کو چاہیئے کہ تمام ہند میں مجالس کریں، عرضداشت تیار کریں اور حضور میں وائسرائے کے اور ان کی کونسل کے حاضر ہوں، اور نیز سکریٹری آف اسٹیٹ تک سلسلہ جنبانی کریں تاکہ قانون بدلا جائے، ۲۲ر فروری ۱۹۰۸ء

مولوی محمد شفیع صاحب بیرسٹرایٹ لا لاہور، میری قطعی رائے ہے کہ فیصلہ پریوی کونسل شرع محمدی کے اصولوں اور احکام کے خلاف ہے، اس امر کے متعلق جناب نے رسالہ میں جو تجویز فرمائی ہے مجھے اس سے کلی اتفاق ہے، ۱۴ر جون ۱۹۰۸ء

نواب سید امیر حسن خاں صاحب کلکتہ صحیفہ معہ کاغذ وقف علی الاولاد ورود ہوا مجھے تمامتر آپ کی تحریکوں سے اتفاق ہے، ۱۴ر فروری ۱۹۰۸ء

جناب مولوی حامد علی خاں صاحب بیرسٹرایٹ لا لکھنؤ، عنایت نامہ و تجویز متعلقہ مسئلہ وقف وصول ہوئے نہایت عمدہ تجویز ہے، میرا خیال اس طرف عرصہ سے ہے بلکہ ایک مسودہ نہایت مدلل و مفصل لکھ کر ایک صاحب کو دیا تھا، ۱۴ر فروری ۱۹۰۸ء

جناب نواب انتصار جنگ بہادر سکریٹری علی گڈھ کالج، وقف اولاد کا مسئلہ آل انڈیا مسلم لیگ کی کارروائی کا بہت خوشگوار جزء ہے، لیکن یہ ظاہر ہے کہ مختلف اجزا کے لحاظ سے مختلف قابلیتوں کے لوگ ان کے سرانجام دینے کو درکار ہوا کرتے ہیں، اگر آپ اس کام کو بدستور اپنے ہاتھ میں رکھیں اور جو مدد آپ کو لیگ سے درکار ہو

وہ لیگ سے لیتے رہیں، اور آخر کار اس مسئلہ کو لیگ گورنمنٹ میں پیش کرے تو میرے نزدیک نہ صرف مناسب ہوگا بلکہ کامیابی کے لئے بہت مفید، ۲۷ر جنوری ۱۹۰۸ء

سید ظہور احمد صاحب مقیم لندن، جسٹس امیر علی صاحب سے اس کے متعلق پوری باتیں ہوئیں، ان کی رائے ہے کہ گورنر جنرل ہند سے درخواست کیجائے، کہ وہ محمڈن لا کے منشا کے مطابق علما کی رائے سے ایک قانون اوقاف کے موافق پاس کر دیویں، پریوی کونسل کو اس میں کچھ اعتراض نہ ہوگا،

ہم مسلمانان موجودہ لندن جن کا تعلق قانون سے ہے آپ کو یقین دلانا چاہتے ہیں کہ ہم ہر قسم کی خدمت جو ہم سے آپ اس کی بابت یہاں پر لینا چاہیں، بجالانے کو تیار ہیں،

۱۳ر مارچ ۱۹۰۸ء از لندن

مولوی محمد شریف آنریری سکرٹیری وقف کمیٹی مقیم لندن، وقف علی الاولاد کے مسئلہ کی ترمیم کے لئے یہاں وقف کمیٹی قائم ہوئی ہے، چونکہ کوئی کام اس کے متعلق بلا آپ لوگوں کی رائے کے کرنا مناسب نہیں ہے، اس لئے اسکی اطلاع دیتا ہوں،

غالباً سکرٹیری آف اسٹیٹ کے پاس یا تو ڈپوٹیشن یا میموریل مع دیگر کاغذات کے انشاء اللہ جلد بھیجیں گے، اس کی اطلاع آپ کو دیں گے، آپ جو کام اس کے متعلق کرنا چاہیں اسکی اطلاع دیجئے گا، ۴ر دسمبر ۱۹۰۸ء

مولوی محمد یوسف صاحب وکیل ہائی کورٹ کلکتہ، دوسرا طریقہ یہ ہے کہ تمام ہندوستان سے درخواست گورنمنٹ میں دیجائے کہ وقف کا قاعدہ شرع کی رو سے ہے، اس کو آئین میں مندرج کر دیا جائے، تاکہ پریوی کونسل کے فیصلہ کا اثر نہ رہے، ۱۹ر مارچ ۱۹۰۹ء،

مولوی مشیر حسین صاحب قدوائی بیرسٹرایٹ لا لکھنؤ، میں تینوں طرح سے مدد دینے

کو تیار ہوں، میں ترتیب و ترجمہ انگریزی کو اپنے ذمہ لوں گا"

نواب نصیر حسین صاحب خیال کلکتہ، گذشتہ مئی میں مسٹر جسٹس امیر علی نے لندن سے ایک خط میں فقیر کو تحریر فرمایا تھا کہ وہ اس امر میں کوشش کرنا چاہتے ہیں اور مسلمانانِ ہند متفق ہوں، تو وہ اور زیادہ آمادہ ہوں، فقیر ہر طرح کی مدد کے لئے حاضر اور کلکتہ بلکہ صوبہ بہار اور بنگال کے متعلق جو خدمت ہمارے سپرد کی جائیگی، اس کی انجام دہی اپنا فرض سمجھے گا،

اس قسم کے اور بہت سے خطوط اور تحریریں، تمام اطراف ملک سے آئیں، یہاں تک کہ بعض بزرگوں نے بلا طلب اس کام کے لئے چندے بھی بھیجدیئے، چونکہ تمام اہل الرائے اس پر متفق تھے، کہ اس معاملہ میں کامیابی کی امید ہے، اور چونکہ سب لوگوں کے نزدیک یہ ضروری تھا کہ اس مسئلہ کے متعلق گورنمنٹ کو یقین دلایا جائے کہ مسلمانوں کا مسلّمہ مذہبی مسئلہ ہے، اس لئے یہ مناسب سمجھا گیا کہ پہلے یہ مسئلہ ندوۃ العلما کے سامنے پیش کیا جائے، جو تمام ہندوستان میں سب سے بڑی مقتدر مذہبی جماعت ہے، چنانچہ اکتوبر ۱۹۰۸ء جلسہ سالانہ ندوہ میں یہ مسئلہ ایک رزولیوشن کی حیثیت سے پیش کیا گیا، اور یہ منظور ہوا کہ اس کے متعلق تمام ہندوستان کے علما سے فتویٰ لیا جائے اور جب فتوے آجائیں تو مزید کارروائی کیجائے، اس تجویز کے مطابق علمار سے استفتا کیا گیا، اور عموماً دونوں مذہب کے علمانے فتویٰ لکھا کہ یہ مسئلہ شریعت اسلام کا مسلّم مسئلہ ہے جب اکثر جگہ سے فتوے آچکے تو ندوۃ العلما کے جلسۂ انتظامیہ مورخہ ۲ مئی ۱۹۰۹ء میں حسب ذیل رزولیوشن منظور ہوئے،

(۱) رسالہ وقف علی الاولاد جو اس مسئلہ پر لکھا گیا ہے اس کا انگریزی میں ترجمہ کرایا جائے مع ان فتووں کے جو علمار نے لکھے ہیں، نیز علماے حرمین سے بھی فتویٰ حاصل کیا جائے، اور مصر میں اسکے متعلق جو فیصلے عدالتوں میں ہو چکے ہوں، بہم پہنچائے جائیں،

(۲) ایک مجلس وقف زیر حمایت ندوہ قائم کیجائے، اور ہندوستان کی تمام مقتدر مجالس سے

اس میں مدد لیجائے،

(۳) ایک عرضداشت اس کے متعلق تیار ہو جسمیں گورنمنٹ سے خواہش کیجائے کہ وہ شریعت اسلام کے موافق قانون تیار کردے،

(۴) اس عرضداشت پر تمام ہندوستان کے مسلمانوں سے دستخط کرائے جائیں اور دستخط کے بعد وہ ایک معزز اور مقتدر ڈپوٹیشن کے ذریعہ سے جناب حضور ویسرائے کی خدمت میں پیش کیا جائے، چنانچہ ان رزولیشنوں کے مطابق کارروائی شروع کردی گئی،

بڑا اطمینان اس امر کے متعلق یہ بھی ہے کہ جناب نواب عماد الملک مولوی سید حسین صاحب بلگرامی ممبر انڈیا کونسل نے اس مسئلہ کے متعلق، لندن میں تحریک شروع کی ہے، اور ایک مفصل خط میں مجھ کو تمام وہ طریقے تحریر فرمائے ہیں جن سے کامیابی حاصل ہونے کی قوی امید ہے

ان حالات کے گذارش کرنے کے بعد بزرگانِ قوم سے امور ذیل کی استدعا ہے،

(۱) جو مجلس وقف زیر حمایت ندوہ قائم کی گئی ہے اس کی ممبری منظور فرمائیں،

(۲) عرضداشت پر دستخط کرنے کے لئے جو فارم تیار کئے گئے ہیں ان پر دستخط فرمائیں اور نہایت کثرت سے ہر طبقہ اور ہر فرقہ کے لوگوں سے دستخط کرائیں،

(۳) چونکہ تمام کاغذات اور فتاوے کے انگریزی ترجمہ اور دیگر کارروائیوں کے لئے ایک معتدبہ رقم درکار ہوگی، اس لئے چندہ سے اعانت فرمائیں، چندہ کی تمام رقمیں بنک بنگال لکھنؤ میں جمع ہوں گی اور اسکے خزانچی جناب مولوی احتشام علی صاحب رئیس لکھنؤ اور نواب علی حسن خانصاحب لکھنؤ ہوں گے، چندہ دینے والے صاحبوں کو اختیار ہے کہ چندہ کی رقم براہ راست بنک بنگال لکھنؤ میں بھیجکر، دونوں صاحبوں کے پاس بنک کی رسید بھیجدیں، یا خود ان صاحبوں کے پاس ارسال فرمائیں،

(الندوہ جلد ۶ نمبر ۴)
۲۶ مئی ۱۹۰۹ء مطابق ربیع الثانی ۱۳۲۷ھ

وقفِ اولاد
کی
کارروائی کہاں تک پہنچی

خدا کا شکر ہے کہ اس تحریک کی طرف قوم نے امید سے زیادہ توجہ کی، اس قدر لوگوں کو معلوم ہوگا کہ اس وقت تک اس تحریک کے متعلق کاغذاتِ ذیل شائع ہو چکے اور ہو رہے ہیں،

(۱) فتاویٰ علمائے ہندوستان متعلق صحتِ مسئلہ وقف اولاد (اس مسئلہ میں سنی و شیعہ دونوں فریق کے علما نے اتفاق کیا ہے)

(۲) رسالہ وقف اولاد جس میں پریوی کونسل کی غلط فہمی کے وجوہ ظاہر کئے گئے ہیں، اور اصل مسئلہ قرآن مجید اور حدیث اور فقہ سے ثابت کیا گیا ہے، (یہ رسالہ ۸ قیمت پر ملتا ہے)

(۳) مختصر کارروائی جس میں ملک کے قابل اور لائق قانون دانوں اور مدبروں کی رائیں اس تحریک کی کامیابی کے متعلق درج کی گئی ہیں،

(۴) فارم جس پر تمام ہندوستان کے مسلمانوں سے دستخط کرانے ہیں،

ان کاغذات کے شائع کرنے پر تمام اطراف سے ہمدردی اور اظہارِ اعانت کے خطوط آئے نہایت کثرت سے لوگوں نے فارم طلب کئے اور ان پر دستخط کرا کر بھیجے جاتے ہیں، اکثر بزرگانِ قوم نے انجمن وقف کی ممبری قبول کی، جن میں سے بزرگان ذیل کا نام خصوصیت

کے ساتھ لیا جاسکتا ہے،

جناب نواب امیر حسن خاں صاحب رئیس	کلکتہ
جناب سید علی امام صاحب بیرسٹرایٹ لا	بانکی پور
جناب خان بہادر محمد شفیع صاحب بیرسٹرایٹ لا	لاہور
جناب فضل حسین صاحب بیرسٹر ایٹ لا	لاہور
جناب مولوی مشیر حسین صاحب قدوائی بیرسٹرایٹ لا و تعلقہ دار	لکھنؤ
جناب مولوی محمد یوسف صاحب وکیل ہائی کورٹ	کلکتہ
جناب سید ظہور احمد صاحب	لندن
جناب خان بہادر شیخ غلام صادق صاحب	امرتسر
جناب مولوی حبیب الرحمٰن خانصاحب شروانی رئیس	علی گڈھ
جناب حاذق الملک حکیم محمد اجمل خانصاحب	دہلی
جناب نواب احمد سعید خاں صاحب طالب	دہلی
جناب سید نواب علی حسن خاں صاحب بہادر	لکھنؤ
جناب آنریبل خان بہادر سید نواب علی صاحب	ڈھاکہ
جناب نواب مزمل اللہ خاں صاحب رئیس	علی گڈھ

جناب راجہ علی محمد خاں صاحب کے سی، ایس، آئی، رئیس محمود آباد نے اس مسئلہ کی طرف توجہ کی، جناب مولوی سید فخری صاحب نے مدراس سے اطلاع دی کہ وہاں ایک جلسہ اس کی تائید میں عنقریب منعقد ہوگا، جس کے صدر انجمن پرنس آف ارکاٹ ہوں گے، بنگال میں جناب مولوی عبد الحق صاحب ہاشمی نے تمام بنگال کی انجمنوں اور عہدہ داروں

کی فہرست مرتب کرائی ہے، اور ہر جگہ فارموں پر دستخط کرانے کے لئے کارروائی شروع کردی ہے،

اب حسب ذیل کارروائیوں کی ضرورت ہے،

(۱) تمام بڑے بڑے شہروں میں انجمن وقف کی شاخیں قائم ہوجائیں،

(۲) فارموں پر کم از کم ایک لاکھ دستخط حاصل کئے جائیں،

(۳) نہایت ضروری اور مقدم امر یہ ہے کہ علماء کے فتاوی اور رسالہ وقف کا انگریزی میں ترجمہ کیا جائے، ابھی تک اس کا معقول انتظام نہیں ہوا، کیونکہ ایسے لوگ جو عمدہ انگریزی لکھ سکتے ہوں اور فقہی اصطلاحات سے واقف ہوں کم ہیں، اور جو ہیں ان کو اپنے اشغال سے فرصت نہیں، ناظرین سے ہم درخواست کرتے ہیں کہ ایسے لائق اشخاص کے نام سے ہم کو مطلع کریں کہ ان کی خدمت میں درخواست کی جائے، ترجمہ کا معقول معاوضہ دیا جائے گا، (اگر وہ معاوضہ لینا منظور کریں گے)

(۴) تمام کارروائی کے انجام دینے کے لئے کم از کم چار ہزار روپئے کی ضرورت ہوگی، اس لئے اس قدر سرمایہ بہم پہونچانے کی کوشش کیجائے، اس وقت تک جن صاحبوں نے چندہ عطا فرمایا ہے اس کی تفصیل حسب ذیل ہے،

انجمن اسلامیہ امرتسر	ما ر
جناب مولوی حبیب الرحمن خانصاحب شروانی رئیس بھیکم پور	۵۰ ر
جناب شیخ غلام صادق صاحب رئیس امرتسر	ما ر
جناب نواب مزمل اللہ خانصاحب رئیس بھیکم پور	ما ر
جناب مرزا سعید الدین احمد صاحب عرف احمد سعید خانصاحب طالب صدر بازار میرٹھ،	۲۵ ر

جناب عبد الماجد صاحب موضع ٹھریا فتح گنج غربی، ضلع بریلی — عـہ/

جناب مولوی محمد عالم صاحب وکیل قنوج — صہ/

جناب سید محمد غلام جبار صاحب وکیل ہائی کورٹ حیدرآباد دکن — دعہ/

جناب سعادت اللہ صاحب رئیس موضع سنگھیا، ضلع پورنیہ — سے/

جناب سید غلام حسن خانصاحب وکیل منصفی کیرانہ ضلع مظفرنگر — دسہ/

(الندوہ جلد ۶ نمبر ۸)

شعبان ۱۳۲۷ھ مطابق ماہ ستمبر ۱۹۰۹ء

اوقافِ اسلامی

آپ اس بات سے واقف ہیں کہ مسلمانوں کی مذہبی تعلیمی اور تمدنی ضروریات روز بروز بڑھتی جاتی ہیں جس کے لئے مصارفِ کثیر درکار ہوتے ہیں اور اس وجہ سے ہر روز ایک نیا چندہ کھولنا پڑتا ہے لیکن اس غریب قوم کی یہ حالت نہیں کہ ان تمام چندوں کی متحمل ہو سکے، اس لئے اکثر کام ناتمام رہ جاتے ہیں، اور قومی ضرورتوں کو سخت نقصان پہنچتا ہے،

اس کی سب سے بہتر اور آسان تدبیر یہ تھی کہ ملک میں کروروں روپئے کے جو اسلامی اوقاف ہیں، اُن کا ایسا معقول انتظام ہوتا کہ وہ بیجا مصارف میں نہ صرف ہوتے، اور صحیح ضروریات کے کام میں آتے، اسی ضرورت سے مسلم لیگ اور دیگر اسلامی انجمنوں نے بارہا یہ رزولیوشن پاس کیا کہ گورنمنٹ ان اوقاف کی نگرانی پر متوجہ ہو، لیکن گورنمنٹ سے یہ جواب ملا کہ دو باتیں ثابت کرنی چاہئیں، ایک یہ کہ یہ خواہش تمام قوم کی طرف سے ہے، دوسرے یہ کہ وہ اوقاف صحیح مصرف میں نہیں صرف کئے جا رہے ہیں، اس کے بعد مسلم لیگ یا اور کسی انجمن نے کچھ کارروائی نہیں کی، حقیقت یہ ہے کہ یہ کہدینا نہایت آسان ہے کہ اوقاف کا انتظام کیا جائے لیکن یہ بتانا مشکل ہے کہ کون کرے اور کس طرح کیا جائے گورنمنٹ تو اس لئے دست اندازی نہیں کر سکتی کہ وقف عموماً ایک مذہبی چیز ہے، اور گورنمنٹ کسی مذہبی چیز میں ہاتھ ڈالنے سے ہمیشہ محترز رہتی ہے، اور اس کو محترز رہنا چاہئے، قوم میں کوئی شخص یا چند اشخاص متوجہ ہوں تو وہ کیا کر سکتے ہیں،

متولیانِ اوقاف پر کوئی اختیار حاصل نہیں، عدالت میں اگر مقدمات دائر کئے جائیں تو اس طولِ عمل اور دردسری اور سب سے بڑھکر مصارف کا کون متکفل ہو سکتا ہے،

اس بنا پر میں چاہتا ہوں کہ ایک مختصر سی کمیٹی قائم ہو جو اس کی تدبیروں پر غور کرے، اور کوئی صحیح اور متعین اور قابلِ عمل طریقہ تجویز کر کے ایک اسکیم (خاکہ) بنائے جو قوم کے سامنے پیش کیجائے اور فیصلہ کے بعد اس پر عمل کیا جائے، اس بنا پر میں آپ سے خواہش کرتا ہوں کہ آپ اسکی ممبری قبول فرمائیں،

چند سرسری باتیں میں بہ دفعاتِ ذیل پیش کرتا ہوں،

(۱) ایک موریل تیار کیا جائے جسمیں انتظامِ اوقاف کی خواہش گورنمنٹ سے کیجائے اور اس موریل پر اس کثرت سے مسلمانوں کے ہر طبقہ سے دستخط کرائے جائیں کہ یہ موریل تمام قوم کی طرف سے سمجھا جائے،

(۲) گورنمنٹ سے جس قسم کی نگرانی کی خواہش کیجائے، اس طریقے کی ہو کہ مذہبی دست اندازی کا کسی طرح احتمال پیدا نہ ہونے پائے، مثلاً اس کا یہ طریقہ ہو کہ ایک کمیٹی قائم کی جائے جس کے ارکان تمام صوبوں سے نیابتانہ طریقے پر انتخاب کئے جائیں اور انتخاب کی تمامتر کارروائی صرف اسلامی جماعت کی طرف سے انجام پائے، پھر گورنمنٹ سے درخواست کیجائے کہ اس کمیٹی کو باقاعدہ تسلیم کرے اور اس کو باضابطہ اختیارات تحقیقات وغیرہ کے دیئے جائیں، پھر اس کی مرتب کردہ رپورٹ ملک میں شائع کیجائے اور گورنمنٹ سے درخواست کیجائے کہ اس کے مطابق عمل کیا جائے،

(۳) تیموری سلطنت میں تمام اوقاف کے انتظام کا ایک خاص عہدہ تھا جس کو صدرالصدور کہتے تھے، کیا گورنمنٹ سے یہ درخواست نہیں کیجا سکتی کہ یہ عہدہ دوبارہ پھر قائم کیا جائے،

لیکن صدر الصدور کا تقرر اُسی بنا بتانہ اصول پر اسلامی جماعت کی طرف سے ہو تاکہ گورنمنٹ کے متعلق کسی قسم کی دست اندازی کا احتمال نہ پیدا ہو سکے، ان کے علاوہ اور جو تجویزیں آپ کے خیال میں آئیں آپ تجویز فرمائیں،

(تاریخ ۲۶؍ جنوری ۱۹۱۴ء)

(مطبوعہ)

وقفِ اولاد کے مسئلہ

کے متعلق

ایک نہایت ضروری تحریک

جناب من، یہ ایک بدیہی اور مسلّم الثبوت واقعہ ہی کہ انگریزی گورنمنٹ نے عموماً یہ اصول ملحوظ رکھا ہی اور ابتدائے حکومت سے آجتک اس پر نہایت مضبوطی سے قائم ہی، کہ کسی مذہب کے مذہبی احکام اور مسائل سے بلا کسی سخت مجبوری حالت کے تعرض نہ کیا جائے اور یہ وہ خصوصیت ہی کہ انگریزی گورنمنٹ کے سوا تمام دنیا مین اسکی بہت کم مثال مل سکتی ہی، با این ہمہ وقفِ اولاد کے مسئلہ مین قیصر ہند نے بمشورۂ پریوی کونسل جو فیصلہ صادر کیا ہے وہ فقہ اسلام کے خلاف ہی جسکی وجہ یہ ہے کہ بعض عدالتون نے غلطی سے یہ سمجھا کہ اسلامی فقہ سے اولاد کے حق مین وقف کرنا ثابت نہین ہوتا، اور عامی آدمی گمان بھی یہی کرسکتا ہی کہ وقف خیرات کا نام ہی اور اولاد پر خیرات کرنے کے کیا معنی ہوسکتے ہین جسٹس مسٹر امیر علی صاحب سابق جج ہائیکورٹ کلکتہ نے اپنے شریک ججون سے مشورہ کرکے اس مسئلہ کو طے کیا تھا، لیکن اپنے فیصلہ مین فقہ کی کتابون کے حوالے نہین دیے تھے اس لئے پریوی کونسل نے اسکے ساتھ اعتنا نہین کیا اور وقفِ اولاد کو ناجائز قرار دیا،

لیکن چونکہ یہ مسئلہ فقہ اسلامی کا ایک مسلّم مسئلہ ہے اور پریوی کونسل نے جو فیصلہ کیا ہی وہ صرف غلط فہمی کی بنا پر ہے اسی لئے یہ یقین ہے کہ اگر گورنمنٹ انگریزی اور پریوی کونسل کو یقین دلایا جا ئے کہ یہ ایک مذہبی مسئلہ ہی اور اسمین مداخلت کرنا مذہبی احکام مین مداخلت کرنا ہی تو یہ قطعی ہے کہ پریوی کونسل اپنے فیصلہ کو مسترد کریگی، اس بنا پر تمام مسلمانون کو اس امر کے متعلق ایک متفقہ کوشش کرنی چاہیے جسکا طریقہ حسب ذیل ہے،

(۱) ایک رسالہ اردو زبان مین نہایت تفصیل اور تحقیق کے ساتھ فقہ کی مستند کتابون سے تیار

کیا جائے جسمین ثابت کیا جائے کہ وقفِ اولاد فقہ اسلامی کا ایک مسلّم اور قطعی مسئلہ ہے،

(۲) اس رسالہ پر تمام علماے ہندوستان سے دستخط کرائے جائین،

(۳) اس رسالہ کا انگریزی زبان مین ترجمہ کرایا جائے،

(۴) ہندوستان کے ہائیکورٹون اور پریوی کونسل نے جس بنا پر وقفِ اولاد کو ناجائز قرار دیا ہے ان دلائل سے تعرض کیا جائے اور ان کی غلطی دکھائی جائے،

(۵) ایک محضر اس مضمون کا تیار کیا جائے کہ چونکہ وقفِ اولاد کا مسئلہ مسلمانون کا ایک مذہبی مسئلہ ہے، اس لئے پریوی کونسل نے اس کے متعلق جو غلط فہمی پیدا کی ہے اس کی اصلاح قانون کے ذریعہ سے کردی جائے،

(۶) اس محضر پر تمام اسلامی انجمنون اور عام مسلمانون کے دستخط کرا کے گورنمنٹ کے پاس بھیجا جائے،

ان تمام امور کے انجام دینے کے لئے ایک رقم کی ضرورت ہے جس کی تعداد تخمیناً دو تین ہزار ہوگی جس سے رسالہ کی تیاری، انگریزی ترجمہ اور خط کتابت کے مصارف ادا ہوسکین اس بنا پر ہم تمام مسلمانانِ ہندوستان سے التجا کرتے ہین کہ اگر وہ اس تدبیر کو ضروری سمجھتے ہین تو خاکسار کو مطلع فرمائین اور یہ بھی ظاہر کرین کہ وہ وجوہِ مفصلۂ ذیل مین سے کس قسم کی شرکت کرسکتے ہین

(۱) مشورہ اور رائے مین شرکت،

(۲) چندہ مین شرکت،

(۳) رسالہ کی ترتیب، اور طیاری، اور قانونی مشورہ اور انگریزی ترجمہ کرنے مین شرکت،

(۲۴ ردسمبر ۱۹۰۸ء)

میموریل

متعلق نماز جمعہ

ہم تمام مسلمانانِ ہندوستان جن میں سنی شیعہ، اہل حدیث، اور تمام اسلامی فرقے داخل ہیں حضور کی توجہ ایک نہایت اہم اور عظیم الشان مسئلہ کی طرف مبذول کرانا چاہتے ہیں، جس کا اثر ان تعلقات پر پڑتا ہے جو مسلمانوں کو گورنمنٹ انگلشیہ کی رعایا ہونے کی حیثیت سے حاصل ہیں، اس مسئلہ کی تفصیل حسب ذیل ہے،

۱۔ انگلش گورنمنٹ کی سب سے بڑی خصوصیت جو اس کو تمام دنیا کی سلطنتوں سے ممتاز کرتی ہے، یہ ہے کہ اس نے رعایا کے تمام مختلف مذاہب کو آزادی دی ہے، اور انکے تمام معتقدات اور ارکان مذہبی کا اس طرح احترام کرتی ہے، کہ کوئی شخص اپنے فرائض مذہبی کے بجانے سے قاصر نہیں رہ سکتا، گورنمنٹ نے ابتدائے حکومت ہی میں اس اصول کا اظہار کر دیا تھا، اور آج تک گورنمنٹ نے اس اصول کو نہایت پابندی اور احتیاط کے ساتھ ملحوظ اور معمول بہ رکھا ہے۔

۲۔ مسلمانوں کے جو اعمال مذہبی ہیں ان میں بعض اعمال وہ ہیں جن کو مذہبی اصطلاح میں فرض کہتے ہیں، یہ اعمال صرف ۵ ہیں اور ان کا یہ درجہ ہے کہ جو مسلمان ان میں سے کسی فرض کو ترک کر دے وہ مذہبًا سخت جرم کا مرتکب ہوگا جس کی سزا آتشِ دوزخ ہے،

۳- ان فرائض میں ایک فرض جمعہ کی نماز ہے جو کہ جمعہ کے دن دوپہر کے بعد ادا کی جاتی ہے۔ اور جس کے لئے شرط ہے کہ مسجد میں اور جماعت کے ساتھ ادا کیجائے،

۴- قرآن مجید میں جو کہ مسلمانوں کی کتاب الٰہی ہے اس نماز کے متعلق یہ صریح حکم ہے،

یا ایھا الذین آمنوا اذا نودی للصلوٰۃ	مسلمانو! جب جمعہ کی اذان ہو تو خدا کی
من یوم الجمعۃ فاسعوا الی	یاد (نماز) کے لئے دوڑو، اور خرید و
ذکر اللہ وذروا البیع ذالکم	فروخت چھوڑ دو، یہ تمھارے لئے بہتر
خیر لکم ان کنتم تعلمون ؕ	ہے اگر تم سمجھو،

۴- اس نماز کی اہمیت کا یہ نتیجہ ہے کہ دنیا میں جس قدر اسلامی سلطنتیں اور ریاستیں ہیں ان میں جمعہ کے پورے دن کی تعطیل دیجاتی ہے تاکہ لوگ اطمینان کے ساتھ مساجد میں یہ فرض مذہبی ادا کر سکیں، مصر اگرچہ انگلش حکومت کے زیر اثر ہے اور تمام بڑے بڑے محکموں اور ہائیکورٹ میں انگلش افسر ہیں، تاہم وہاں عموماً جمعہ کے دن تعطیل ہوتی ہے،

۵- ہندوستان کی اکثر ہندو ریاستوں میں باوجود ہندو ریاست ہونے کے اور باوجود اس کے کہ وہاں مسلمان ملازموں کی تعداد ہندؤں سے بہت کم ہوتی ہے، جمعہ کی تعطیل دی جاتی ہے،

۶- انگریزی حکومت کے آغاز میں رعایا کا یہ خیال رہا کہ انگلش حکومت ایک فارن حکومت ہے، اور اسی لئے ہم کو اس سے یہ درخواست کرنے کا حق نہیں، کہ وہ اپنے انتظامات حکومت میں ہمارے مذہبی اعمال کا ہر موقع پر خیال رکھے، اس بنا پر نماز جمعہ کے متعلق کوئی صدا مسلمانوں کی طرف سے بلند نہیں ہوئی، لیکن جس قدر مسلمانوں کا تعلق گورنمنٹ سے بڑھتا جاتا ہے، اور جس قدر مسلمانوں کی عام پبلک انگلش حکومت کے اصول انصاف وطریق حکومت

سے زیادہ آشنا ہوتی جاتی ہے، اسی قدر ان کا یہ احساس بڑھتا جاتا ہے، کہ اس فرض کے ادا کرنے
سے ان کو محروم نہ کیا جانا چاہئے،

۷۔ مسلمانوں میں انگریزی تعلیم روز بروز بڑھتی جاتی ہے، اس وجہ سے سرکاری ملازمتوں
میں بھی ان کی تعداد بڑھتی جاتی ہے، اور بڑھتی جائے گی، اس لئے ایک تعداد کثیر کا یہ محسوس
کرنا کہ ان کو ملازمت سرکاری کی وجہ سے اپنے ایک فرض مذہبی سے باز رہنا پڑتا ہے،
ایک سنگین مسئلہ بنجاتا ہے،

(قلمی)

علمی و تاریخی

ایک عظیم الشان تحریک

یعنی

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مفصل اور مستند سوانحعمری مرتب کرنے کی تجویز

کیا عجیب بات ہے، ہندوستان میں چھ کروڑ مسلمان ہیں، مشرقی علوم و فنون ابھی تک زندہ ہیں، نہایت لائق اور قابل فخر انشا پرداز موجود ہیں، ملکی زبان نے ایسی قابل قدر تصنیفات پیش کیں کہ روم و مصر میں مضمون کے لحاظ سے ان کا جواب نہیں، قومی روایات کا مذاق بچہ بچہ کی رگ رگ میں ہے، جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ قدیم اور جدید دونوں گروہ کو یہ عقیدت و نیاز ہے کہ آپ کے نام پر جان و مال قربان کر دینا کوئی بات نہیں،

یہ سب ہے لیکن اتنی بڑی وسیع قوم اور اتنی عالمگیر زبان (اردو) میں جناب رسول اللہ صلعم کی کوئی سوانحعمری نہیں، یا ہے تو ایسی ہے کہ اس کو سیرت نبوی کہنا آنحضرت صلعم کی روح مبارک کو آزردہ کرنا ہے، سیرت نبوی کی ضرورت اس لحاظ سے اور بڑھ جاتی ہے کہ قوم میں جدید تعلیم وسعت سے پھیلتی جاتی ہے، اور یہی جدید تعلیم یافتہ گروہ ایک دن قوم کی قسمت کا مالک ہوگا، یہ گروہ آنحضرت صلعم

کے حالاتِ زندگی اگر جاننا چاہتا ہے تو اردو میں کوئی مستند کتاب نہیں ملتی، اس لئے اسکو چارو ناچار انگریزی تصنیفات کی طرف رجوع کرنا پڑتا ہے، جن میں یا تعصب کی رنگ آمیزیاں ہیں یا ناواقفیت کی وجہ سے ہر موقع پر غلطیاں ہیں،

ایک خاص بات یہ ہے کہ سیرت نبوی کی ضرورت پہلے صرف تاریخی حیثیت سے تھی لیکن اب عقائد کی حیثیت سے بھی ہے، یورپ جو اسلام پر نکتہ چینی کرتا ہے، زیادہ تر اس بنا پر کرتا ہے کہ بانی اسلام کے اخلاق و عادات و تاریخ زندگی ایسی نہیں کہ ان کو خدا کا بھیجا ہوا معصوم پیغمبر کہا جا سکے، یہی وجہ ہے کہ سر ولیم میور صاحب نے آنحضرت صلعم کے حالاتِ زندگی پر جو کتاب لکھی اس کو پادریوں نے اپنا خاص کام سمجھا، اور خود صاحب موصوف نے تصریح کی ہے کہ انھوں نے یہ خدمت زیادہ تر پادری فنڈر صاحب کی رفعِ ضرورت کے لئے انجام دی،

میں ایک مدت سے ان باتوں کا احساس کر رہا تھا لیکن اس بنا پر قلم اٹھانے کی جرأت نہیں ہوتی تھی، کہ آنحضرت صلعم کے واقعات میں ایک حرف بھی صحت کے اعلیٰ معیار سے ذرا اتر جائے تو سخت جرم ہے،

یہی وجہ ہے کہ عربی زبان میں سیکڑوں ہزاروں کتابیں لکھی گئیں، لیکن جو گروہ زیادہ محتاط اور ادب شناس تھا، اس نے بہت کم جرأت کی، کبار محدثین مثلاً امام بخاری، مسلم، ترمذی، ابن داؤد، ابن ماجہ، امام مالک نے سیرت نبوی میں کوئی کتاب نہیں لکھی،

لیکن اس احتیاط سے بہت سے عظیم الشان مقاصد فوت ہوئے جاتے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ مورخینِ اسلام مثلاً طبری، ابن قتیبہ، بلاذری، محمد بن اسحٰق وغیرہ نے جو علم حدیث میں بھی کمال رکھتے تھے باوجود تدین اور احتیاط کے آنحضرت صلعم کے حالات زندگی میں مبسوط کتابیں لکھیں، جس ضرورت نے مورخین کو اس پر آمادہ کیا، وہی آج بھی ہے، بلکہ آج یہ ضرورت اور بھی زیادہ بڑھ گئی ہے،

قوم کی طرف سے ایک مدت سے تقاضا ہے کہ میں سب کام چھوڑ کر سیرت نبوی کی تالیف میں مصروف ہو جاؤں، خود میں بھی اپنی پہلی راے سے رجوع کر چکا ہوں، اور اس شدید ضرورت کو تسلیم کرتا ہوں، لیکن یہ کام انجام دینا آسان کام نہیں، میں اُن مشکلات کو کسی قدر توضیح سے لکھتا ہوں، تاکہ قوم اپنی اور میری ذمہ داریوں کو اچھی طرح سمجھ لے،

عربی میں آنحضرت صلعم کی جس قدر سوانحعمریاں لکھی گئیں، اگرچہ بے شمار ہیں، لیکن جو اصل ماخذ ہیں حسب ذیل ہیں :-

مغازی موسیٰ ابن عقبہ	یہ سب سے قدیم تصنیف ہے، مصنف نے ۱۴۵ھ میں وفات پائی،
مغازی ابن اسحٰق	یہ آغاز دولت عباسیہ کی تصنیف ہے،
سیرت ابن ہشام	مصر میں چھپ گئی ہے،
طبقات ابن سعد	اسکی دو جلد، خاص سیرت نبوی میں ہے،
تاریخ ابن واضح کاتب عباسی،	یورپ میں چھپی ہے، پہلی جلد میں مختصراً سیرت نبوی بھی ہے،
طبری المتوفی سنہ ۳۱۰ ہجری	مشہور کتاب اور ابن الاثیر و ابن خلدون کا ماخذ یہی کتاب ہے،

یہی کتابیں تمام تاریخی کتابوں کا ماخذ ہیں، لیکن ان میں سے ایک کتاب بھی ایسی نہیں جسمیں صرف صحیح واقعات درج کئے گئے ہوں، اس لئے ضرورت ہے کہ ان کی تحقیق و تنقید کیجائے، ان کتابوں میں اکثر راویوں کے نام مذکور ہیں، اس لئے اگر اُن کے حالات معلوم ہو جائیں تو آسانی سے روایت کے صحیح یا غیر صحیح ہونے کا حال معلوم ہو سکتا ہے لیکن مشکل یہ ہے کہ اسماے رجال کی جو مشہور کتابیں ہیں، مثلاً تہذیب التہذیب و تہذیب الکمال و تہذیب الاسماء وغیرہ ان میں ان راویوں میں سے اکثر کے حالات نہیں ملتے، اس بنا پر سینکڑوں کتابوں کا مطالعہ کرنا اور ان راویوں کا پتہ لگانا پڑیگا، اس کے ساتھ تاریخی سلسلہ سے الگ بہت سی حدیث اور آثار کی نایاب اور

مستند کتابوں کو مہیا کرنا پڑیگا جن سے سیرت نبوی کے متعلق صحیح واقعات معلوم ہوں،

حدیث کی کتابوں میں آنحضرت صلعم کے بہت سے واقعات مختلف واقعات کے ضمن میں آجاتے ہیں، اس غرض سے حدیث کی تمام کتابیں چھاننی پڑیں گی، کہ ریزہ چینیوں سے ذخیرہ مہیا کیا جائے

یہ ایک طرف کی مشکلات ہیں، دوسری طرف یہ دقت ہے کہ آج کل جو شخص سیرت نبوی کو مرتب کرنا چاہے اس کا بڑا فرض یہ ہے کہ یورپ نے آنحضرت صلعم کے حالات میں جو بے شمار کتابیں لکھی ہیں ان پر نظر رکھتا ہو، اگرچہ اس میں شک نہیں کہ یورپ کا ماخذ صرف عربی ہی تصنیفات ہو سکتی ہیں، لیکن یورپین مصنف عموماً ان ہی واقعات کو اس طرح ترتیب دیتے ہیں کہ نتیجہ ان کے موافق نکلتا ہے اس کے ساتھ وہ بہت سے ایسے راویوں سے استناد کرتے ہیں، جو مسلمانوں میں عام طور پر مشہور و معروف ہیں، لیکن درصل ان کا کچھ اعتبار نہیں مثلاً میور صاحب نے اپنی کتاب کا مدار زیادہ تر واقدی اور ابن ہشام پر رکھا ہے، حالانکہ یہ دونوں محدثین کے نزدیک چنداں قابلِ اعتبار نہیں،

غرض یہ نہایت ضروری ہے کہ کم از کم انگریزی زبان میں جو کتابیں سیرت نبوی کے متعلق لکھی گئی ہیں، ان سے واقفیت حاصل کیجائے،

واقعاتِ مذکورۂ بالا سے ثابت ہو گا، کہ ایک مکمل سیرت کی تصنیف کے لئے امور ذیل کی ضرورت ہے،

(۱) ایک وسیع کتب خانہ جسمیں وہ تمام عربی اور انگریزی کتابیں ہوں جنکا اشارہ اوپر ہو چکا

(۲) علمار کی ایک جماعت جن سے مشورہ اور مدد مل سکے، ندوہ میں قابل اربابِ علم موجود ہیں،

(۳) ایک اسٹاف جس میں حسب ذیل اشخاص ہوں،

معاون (۲) جو روایتوں کے نقل و انتخاب میں مدد دیں،

کاتب (۲) مسودہ کے صاف کرنے کے لئے،

مترجم انگریزی (۲) جو انگریزی کتابوں کا ترجمہ کریں،

چپراسی، (۱)

ان مصارف میں سے کتابوں کے خریدنے کے لئے یکمشت رقم درکار ہے، باقی ماہوار مصارف ہیں جس کی تعداد دو سو پچاس روپیہ ماہوار سے کسی طرح کم نہیں ہو سکتی، اور چونکہ محض اردو اڈیشن بے کار ہے، جب تک انگریزی اور عربی میں شائع نہ ہو سیرت نبوی کی اشاعت کی ضرورت سب سے زیادہ یورپ میں ہے، کہ یورپ کے خیالات کی اصلاح ہو، اسلئے کتاب کی تصنیف کیساتھ اس بات کی بھی ضرورت ہے کہ اس کا انگریزی میں بھی ترجمہ کیا جائے اس بنا پر مصارف کی تعداد میں اور بھی اضافہ ہو جائیگا،

ان اسباب کی بنا پر ایک مجلس قائم کیجاتی ہے جس کا نام مجلس تالیف سیرت نبوی ہوگا اس کے ارکان حسب ذیل ہوں گے،

مربی جو حضرات کم از کم یکمشت ہزار روپیہ یا دس روپیہ ماہوار عنایت فرمائیں،

ارکان، جو حضرات ایک روپیہ ماہوار عنایت فرمائیں،

معین، جو حضرات نایاب قلمی تصنیفات ملکیۃً یا استعارۃً عنایت فرمائیں یا کسی اور مفید طریقہ سے مدد دیں،

ماہانہ چندہ وبلو رسید کے ذریعہ سے وصول کیا جائیگا،

جو حضرات اس تجویز کے متعلق خط کتابت کرنا چاہیں وہ مجھکو لکھنؤ کے پتہ سے مخاطب فرمائیں

(الندوہ ج ۹ نمبر ۱، جنوری ۱۹۱۲ء مطابق محرم ۱۳۳۰ھ)

ایک اور آفتابِ علم غروب ہو گیا

ہندوستان میں قدیم تعلیم کی یادگاریں اس قدر کم رہ گئی ہیں کہ گویا کچھ نہیں رہیں تاہم اس وقت تک ہندوستان کے علمی افق میں جو روشنی ہے، اسی تعلیم کی ہے، فقہ، اصول، حدیث، تفسیر، ادب، کلام کا کوئی مشکل مسئلہ آج دریافت کرنا ہو تو نئی نسلیں بالکل بیکار ثابت ہونگی، اس بنا پر جب اس قدیم عمارت کا کوئی ستون گرتا ہے، تو دل کانپ جاتا ہے، کہ اب کیا ہوگا،

اساتذۂ قدیم میں سے صرف دو شخص باقی رہ گئے تھے، مولانا لطف اللہ صاحب اور مولانا محمد فاروق صاحب چریاکوٹی، اور افسوس کہ ان دو میں سے بھی ایک نے اپنی جگہ خالی کر دی، یعنی مولانا محمد فاروق صاحب نے ۲۸ اکتوبر ۱۹۰۹ء کو انتقال کیا، اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن،

مولانائے موصوف چریاکوٹ کے رہنے والے تھے، جو اعظم گڈھ کے ضلع میں ایک مردم خیز قصبہ ہے، انھوں نے اپنے بڑے بھائی مولوی عنایت رسول صاحب اور مولانا محمد یوسف صاحب فرنگی محلی اور مولوی نعمت اللہ صاحب فرنگی محلی سے تمام علوم کی تکمیل کی تھی، علم ادب اگرچہ بطور خود حاصل کیا تھا، تاہم بہت بڑے ادیب اور ناظم و ناثر تھے،

مزاج میں سخت وارستگی، بے پروائی اور بے تکلفی تھی، اس لئے ایک جگہ قیام نہیں کر سکتے تھے، نہ کوئی کام باقاعدہ انجام دے سکتے تھے اسی وجہ سے کوئی بڑی خدمت یا عہدہ نہ حاصل کر سکے نہ اس کی ان کو پروا تھی، علمی ذوق اس قدر غالب تھا کہ سخت سی سخت دنیاوی کشمکشوں میں بھی

تعلم و تعلیم کا سلسلہ منقطع نہیں ہوتا، بے قاعدگی کی وجہ سے کوئی مستقل تصنیف نہیں کی، چھوٹے چھوٹے دو چار رسالے لکھے، اور وہ بھی ناتمام رہ گئے، تمام مسائلِ علمیہ میں مجتہدانہ رائے رکھتے تھے، اور جب کوئی کتاب پڑھاتے تھے تو عموماً مصنف کی غلطیوں اور فروگذاشتوں سے تعرض کرتے تھے،

میں نے معقولات کی تمام کتابیں مثلاً میر زاہد، ملا جلال مع میر زاہد، حمد اللہ، شرح مطالع، صدرا، شمس بازغہ ان ہی سے پڑھیں، اور میری تمامتر کائنات ان ہی کے افادات ہیں، فارسی کا مذاق بھی ان ہی کا فیض ہے، اکثر اساتذہ کے اشعار پڑھتے اور ان کے ضمن میں شاعری کے نکتے بتاتے،

چونکہ ان کی کوئی علمی تصنیف شائع نہیں ہوئی، اس لئے ہم چند اشعار درج کرتے ہیں کہ مشتے نمونہ از خروارے،

رسیدی در بودی دین و دل در جنبشِ چشمے — بہ یک گردش چو جام بادہ کارم ساختی رفتی
بہ گلشن آمدی و غنچہ را در خوں جگر کردی — نسیم آسا سمندِ ناز بر گل تاختی رفتی

نہ دارد دل دگر تابِ طپیدن — نگاہ خویش را رحم آشنا کن
نہ دارد چشم من تابِ جمالت — بیا چوں مردمک در دیدہ جا کن

زمانہ گر ز خطِ حکم تو بہ پیچد سر — دو رشتہ شب و روزش بہ تن شود زنا

(الندوہ جلد ۶ نمبر ۹)
ماہ اکتوبر ۱۹۰۹ء مطابق رمضان ۱۳۲۷ھ

ابن رشد

جناب اڈیٹر صاحب میں نے اخبار آزاد مطبوعہ ۲۶ ر نومبر ۱۸۸۸ء میں وہ ریویو پڑھا جو آپ "المامون" پر نہایت قابلیت سے لکھ رہے ہیں، اس ریویو میں آپ نے مثالاً ایک واقعہ کا ذکر کیا ہے جو آپکے نزدیک مسلّم اور بدیہی الثبوت مسئلہ بن گیا ہے یعنی یہ کہ امام ابوالولید ابن رشد جو مسلمانوں میں ارسطو کا ہم پلہ تھا، اسلامی تاریخ میں ایک گم شدہ شخص ہے، ۱۲ر اکتوبر ۱۸۸۸ء کے پرچہ میں بھی آپ نے اسکو مثالاً پیش کیا ہے اور جہاں تک مجھ کو یاد ہے ایک اور پرچہ میں بھی آپ نے اس واقعہ کو عبرت انگیز صورت میں دکھایا ہے،

مسٹر سید حسن بلگرامی المخاطب بہ عماد الدولہ کا وہ مضمون جو "ابن رشد اور اس کے معاصرین" پر ہے، جب اول اول اخبار اردو گائڈ میں چھپا تو اس وقت مجھ کو گمان ہوا کہ اس خاص امر کی نسبت وہ بہت سے لوگوں کے لئے غلطی میں پڑنے کا باعث ہوگا، آپ مجھے معاف فرمائیگا، اگر میں یہ کہوں کہ اس دام میں پہلے پھنسنے والے آپ تھے، مسٹر عماد الدولہ کے یہ الفاظ ہیں "افسوس ہے کہ ایسے بڑے حکیم کا نام تک ہمارے یہاں کسی کو معلوم نہیں ہے، نہ حاجی خلیفہ نے کشف الظنون میں نہ ابن خلکان نے وفیات الاعیان میں اس حکیم کا ذکر کیا ہے، غرضکہ ابن رشد کا اگرچہ ہماری مشرقی کتابوں میں کسی نے نام تک بمشکل لکھا ہے، ابن رشد کی تصنیفات بکثرت ہیں، اگرچہ کوئی ایک بھی ان میں سے ہمارے ہاتھ میں موجود نہیں ہے، ابن رشد کی اصل کتابیں ہی مفقود ہیں، عربی سے

عبری اور عربی سے لاطینی میں جس قدر ترجمہ ہوئی تھیں، یورپ کے کتبخانوں میں دستیاب ہوتی ہیں"

ان مکرر اور واضح تصریحات سے اگر آپ نے خیال فرمایا کہ مسلمانوں کی علمی دنیا میں ابن رشد ایک گمنام شخص ہے، تو چنداں تعجب نہیں لیکن میں آپ سے التجا کرتا ہوں کہ آپ عماد الدولہ بہادر کی پیروی کر کے اسلام کی تاریخی وسعت کی نسبت بدظن نہ ہو جئے، علامہ مقریزی تاریخ نفح الطیب میں ابن رشد کو فلسفہ کا امام بتاتے ہیں (دیکھو نفح الطیب مطبوعہ فرانس ۱۸۶۱ء جلد ثانی صفحہ ۱۲۵)

معجب فی تلخیص المعرب میں ابن رشد کا مفصل تذکرہ کیا ہے، اور لکھا ہے کہ بادشاہ کے ایما سے اس نے تمام تصنیفات ارسطو کا ایک جامع خلاصہ لکھا ہے، جو ایک سو پچاس جزو میں تھا خلیفہ ناصر لدین اللہ عباسی کے زمانہ میں جن مشہور علمائے انتقال کیا، ان کی فہرست میں حافظ جلال الدین سیوطی ابن رشد کا نام ان لفظوں سے لکھتے ہیں" صاحب العلوم الفلسفیۃ" صاحب کشف الظنون نے اس کے متعدد تصنیفات کا ذکر کیا ہے، (دیکھو تہافت الفلاسفہ و کتاب الکون والفساد کے تحت میں) کیا اس پر بھی آپ عماد الدولہ کے اس حصر کو تسلیم کریں گے؟ یافعی نے فقط اس قدر لکھا ہے کہ ۵۹۵ھ میں اس نے وفات پائی، عماد الدولہ تو ابن رشد کے تمام تصنیفات کو ناپید بتاتے ہیں لیکن اس کی تین معتمد تصنیفیں تو خود ہمارے استعمال میں ہیں یعنی تہافت الفلاسفہ امام غزالی کارد (مطبوعہ مطبع اعلامیہ مصر ۱۳۰۲ھ) اور فصل المقال و کتاب الکشف عن مناہج الادلہ (مطبوعہ جرمنی مقام سوچین ۱۸۵۹ء) آپ کی طرح میں بھی عماد الدولہ بہادر کی علمی قابلیت کا بہت ادب کرتا ہوں، لیکن اس گستاخی پر جس چیز نے مجبور کیا وہ یہ ہے کہ ان کی تحریر مسلمانوں کی تاریخی واقفیت پر ایک بیجا حملہ ہے،

آزاد۔ لکھنؤ

۷ دسمبر ۱۸۸۸ء

المامون

جنابِ من۔ آپ کے متواتر خطوط پہونچے اکہ میں اُن تحریرات کی طرف متوجہ ہوں جو المامون کے متعلق اخبار آزاد میں شائع ہوئیں، بے شبہہ آپ کا مقصود صرف یہ ہے کہ امرِ حق فیصل ہو جائے، لیکن افسوس ہے کہ نہ مجھکو فرصت اور نہ اس قدر عام رائیں لحاظ کی مستحق ہیں آج کل جس کے ہاتھ میں قلم ہے وہ نچلا نہیں بیٹھ سکتا، میں کس کس کی طرف توجہ کروں گا، آپکو بہت بڑا شبہہ یہ پیدا ہوا ہے کہ دولت عباسیہ میں رشید انتخاب کے قابل تھا نہ مامون ریویو لکھنے والوں نے بھی اس بات کو زیادہ طول دیا ہے، اس امر اور تمام دوسرے اعتراضات کا تصفیہ وہ شخص کرسکتا ہے، جس نے نہایت وسعت کے ساتھ تاریخی معلومات فراہم کی ہیں، اور ساتھ ہی باریک بیں اور تاریخی اصول کا نکتہ شناس بھی ہو، رشید کے تمام کارنامے کس کی نظر میں ہیں؟ "المامون" اور چند معمولی کتابوں سے جو واقفیت حاصل کی گئی ہے وہ رشید پر رائے دینے کے لئے کافی نہیں ہے، نہ کہ موازنہ جو بڑی تحقیق و تدقیق کا نتیجہ ہے "المامون" میں رشید کا تذکرہ ضمناً آگیا ہے، اور جس قدر لکھدیا گیا ہے وہی مناسب موقع تھا، رشید کی برائیاں لوگوں نے صرف برامکہ پر محدود و خیال کیں، اور اس بنا پر مامون سے موازنہ کرنے کو طیار ہو گئے، مامون کی جس قدر غلطیاں اور برائیاں لوگوں نے گنائی ہیں، اس کے مقابل میں رشید کے اور تمام کارنامے موجود ہیں، برامکہ کا واقعہ رشید کے الزامات کے پلہ کو بھاری

کر دیتا ہے، اگرچہ مجھکو زیبا نہیں کہ میں مرحوم ہارون الرشید کی فرد قرار داد جرم تیار کروں، لیکن اگر ہمارے دوستوں کے خزانۂ معلومات میں المامون اور تاریخ الخلفاء کے سوا اور بھی کچھ ہو تو خیال کریں کہ وہ کون تھا جس نے سرحدی شہروں کے تمام گرجے بعض بیجا تعصب سے منہدم کرادئے؟ کون تھا جس نے اپنے قید خانہ کو بعض شبہ کی بنا پر حضرت موسیٰ کاظم سے آباد کیا تھا؟ کون تھا جس کے درباری اس کی بدمزاجی سے اس قدر خائف رہتے تھے کہ اکثر اوس کے پاس کفن پہن کر جاتے تھے؟ کون تھا جس نے حضرت یحییٰ بن عبد اللہ کو معاہدۂ صلح لکھدیا جس پر تمام علما اور بنو ہاشم کے دستخط تھے، پھر بے وجہ اون کو قید کر دیا؟ اور گو امام محمد صاحب نے کہا بھی کہ یہ بالکل اسلام کے خلاف کارروائی ہے، مگر باز نہ آیا، کون تھا جس کے عہد میں عمال اور عہدہ داران ملکی علانیہ ظلم کرتے تھے، اور سال بھر ایک بار بھی مظلوموں کی فریاد سننے کو دربار نہیں کرتا تھا؟ کون تھا جس کو قاضی ابو یوسف نے نہایت حسرت اور تمنا سے کتاب الخراج میں یوں مخاطب کیا؟

"فلو تقربت الی اللہ عزوجل یا امیر المومنین بالجلوس لمظالم رعیتک فی الشھر او الشھرین مجلسا واحدا تسمع فیہ من المظلوم و تنکر علی الظالم رجوت ان لا تکون ممن احتجب عن حوائج رعیتہ لعلک لا تجلس الا مجلسا او مجلسین حتی یسیر ذلک فی الامصار والمدن فیخاف الظالم وقوفک علی ظلمہ مع انہ متی علم العمال والولاۃ انک تجلس للنظر فی امور الناس یوما فی السنۃ لیس یوما فی الشھر تناھوا باذن اللہ عن الظلم"

"یعنی اگر اے امیر المومنین تو خدا کا تقرب اس طرح حاصل کرتا کہ رعایا کی فریاد سننے کے لئے مہینہ میں بلکہ دو مہینہ میں ایک اجلاس بھی کرتا جسمیں تو مظلوم کی فریاد سنتا اور ظالم سے باز پرس کرتا تو مجھ کو امید تھی کہ تیرا شمار ان لوگوں میں نہ ہوتا جو رعایا کی حاجتیں نہیں سنتے، اور غالباً تو دو ایک ہی اجلاس کرتا کہ ملک

میں یہ چرچا پھیل جائیگا، پس ظالم کو ڈر پیدا ہوگا کہ اس کے ظلم کی تجھ کو خبر نہ ہو جائے، اس کے ساتھ یہ بھی ہے کہ جب عاملوں اور عہدہ داروں کو یہ معلوم ہو جائیگا کہ تو برس دن میں ایک بار بھی لوگوں کی حاجت روائی کے لئے اجلاس کرتا ہے، تو وہ لوگ انشاء اللہ ظلم سے باز رہیں گے"

کون تھا کہ جس کے عہد میں اکثر واقعہ نویس عاملوں سے سازشیں رکھتے تھے، اور بالکل جھوٹ اور فساد انگیز خبریں ہارون الرشید کو لکھتے تھے، جس کی وجہ سے قاضی ابو یوسف نے مجبور ہو کر کتاب الخراج میں اس کا ذکر کیا؟ کون تھا جس کے عہد میں ملک کی تباہی کا یہ حال تھا کہ سواد کے علاقہ میں حضرت عمرؓ نے جو خفیف جمع مقرر کی تھی رعایا اس کو بھی برداشت نہیں کر سکتی تھی، اور آخر قاضی ابو یوسف صاحب کو وہ مقدار جمع گھٹا کر اوس کی توجیہ کرنی پڑی؟ کون تھا جس کا خزانہ اس طرح معمور کیا جاتا تھا کہ جب کسی پر کچھ شبہ ہوا تو اس کا کل مال و متاع ضبط ہو کر خزانۂ شاہی میں داخل کر دیا گیا، علی بن عیسیٰ سے دس کرور درہم چھین کر جو خزانہ میں داخل کئے گئے کیا جائز حق سے لئے گئے؟ کون تھا جس نے اسلام میں یہ نئی بدعت ایجاد کی کہ خلافت کے چند ٹکڑے کئے اور اپنے بیٹوں میں اس کو موروثی جائداد کی طرح تقسیم کیا؟

کیا ان باتوں کے ہم پلہ مامون کی تاریخ میں بھی مل سکتی ہیں؟ افسوس ہے کہ نہ لوگوں کو تمام حالات سے اطلاع نہ واقعات کے موازنہ کرنے کی قابلیت، یہ امور جو میں نے لکھے شاید لوگوں کو چیستاں معلوم ہوں اور تاریخی دفتروں میں اس کے حوالے بھی نہ ڈھونڈھ سکیں، فتوحات کے لحاظ سے رشید کو کیا ترجیح ہے؟ مختصر یہ سمجھ لینا چاہئے کہ رشید نے کوئی نیا ملک فتح نہیں کیا، لیکن مامون کے عہد میں صقلیہ اور کریٹ کی جو فتحیں ہوئیں وہ خاص لحاظ کے قابل ہیں۔ علم و قابلیت کے لحاظ سے سب جانتے ہیں کہ رشید صرف ادب و فقہ و حدیث میں کمال رکھتا تھا، لیکن مامون ان علوم کے علاوہ فنون حکمت کے مختلف صیغوں میں ایک حکیم تسلیم کیا جاتا تھا،

پھر میں کہتا ہوں کہ رشید کی برائیاں میں نے کم گنائیں، رنج ہوتا ہے کہ سینکڑوں برس کے دبے فتنے آج ابھارے جائیں، خیر رشید جو کچھ تھا خوب تھا، ان طرفداروں سے اس کا حق مجھ پر زیادہ ہے، میں نے کچھ سمجھ کے اس کو نہیں لیا، "المامون" پر جو نکتہ چینیاں کی گئی ہیں، وہ اسی طرح تفصیل طلب ہیں، جس طرح رشید و مامون کا موازنہ، کیا آپ یہ چاہتے ہیں کہ میں اپنی اوقات کو ان فضول باتوں میں صرف کروں، آپ یقین فرمائیں کہ مجھکو کبھی عام لوگوں کی تحسین سے نہ خوشی ہوئی، نہ ان کے اعتراض سے رنج، میں چاہتا ہوں کہ لوگ اعتراض کریں، آپ کا جی چاہے تو ان کے جواب کی طرف متوجہ ہوں، مجھکو چھوڑ دیجئے کہ "رائل ہیروز" کے باقی حصے پورے کروں، ؎

رسی آنکہ بدردمن کہ چو من   خامہ گیری و حرف بنگاری

آزاد لکھنؤ

۲۲ر فروری ۱۸۸۹ء

اشاعتِ کتبِ قدیمہ

یہ امر مسلّم ہے کہ مسلمانوں نے کسی زمانہ میں تمام علوم و فنون کو نہایت ترقی دی تھی، اور ہر فن میں اپنے خاص اجتہاد اور تحقیقات کے نتائج قلمبند کئے تھے لیکن رفتہ رفتہ علمی مذاق کو اس قدر تنزل ہوتا گیا کہ آج جو تالیفات و تصنیفات عام طور سے رائج ہیں اکثر وہ ہیں جن میں ایجاد اور جدّت کی جھلک تک نہیں پائی جاتی،

قدمار کی تصنیفات جنمیں ہر جگہ اجتہاد اور ذاتی تحقیقات سے کام لیا گیا ہے، عموماً متروک ہیں، خال خال کوئی قلمی نسخہ کسی بڑے کتب خانہ میں پایا بھی جاتا ہے، تو ہر شخص کو وہاں تک دسترس نہیں، اور اس وجہ سے گویا ان کا وجود و عدم دونوں برابر ہے،

کس قدر تعجب کی بات ہے، کہ مثلاً فقہ حنفی کا تمامتر دار و مدار امام محمد کی روایات و تصنیفات پر ہے، جن کو اصطلاح فقہ میں ظاہر الروایہ کہتے ہیں، لیکن آج ان میں سے بجز جامع صغیر کے جو نہایت مختصر اور سب سے چھوٹی ہے، ایک کتاب بھی موجود نہیں، یہاں تک کہ قسطنطنیہ اور مصر کے عظیم الشان کتب خانے بھی ان سے خالی ہیں، اسی طرح فلسفہ اور منطق میں مسلمانوں کو جن ناموروں پر ناز ہو سکتا ہے وہ یعقوب کندی، فارابی، ابن رشد ہیں، لیکن ان کے تصنیفات اس قدر نایاب ہیں کہ نہ ہونے کے برابر ہیں، قرآن مجید کے اعجاز و فصاحت و بلاغت پر جو کتابیں لکھی گئی ہیں ان میں سے تمام ہندوستان میں ایک کتاب بھی موجود نہیں، تاریخ کی قدیم اور نادر

تصنیفات تو گویا ہمارے ملک میں سرے سے آئیں ہی نہیں بعض قدیم کتابیں جو یورپ میں چھپی ہیں، لیکن قطع نظر ان کے گراں قیمت ہونے کے ہر شخص کو بہم نہیں پہونچ سکتیں، ان واقعات کی بنا پر مجھکو یہ خیال آیا کہ ایک مجلس قائم کی جائے جو اس مفید اور اہم کام کو انجام دے، اگرچہ حیدر آباد کی مجلس دائرۃ المعارف کا بھی یہی موضوع ہے لیکن جو تجربہ اس کے ابتدائے قیام سے اس وقت تک ہوا ہے اس کے لحاظ سے یہ کہنا ناموزوں نہیں، کہ وہ اس درد کی پوری دوا نہیں،

ملک میں عربی زبان کی جو کساد بازاری ہے اوس کے لحاظ سے اگرچہ یہ تجویز فی الجملہ بے محل معلوم ہوتی ہے لیکن ۵ کروڑ مسلمانوں میں سے دو چار سو ایسے شائق ضرور نکل آئیں گے جو معمولی قیمت پر کتاب کو خرید لیں، اور اگر اتنا بھی ہوا تو ہم اس کام کے شروع کرنے پر آمادہ ہیں،

بالفعل یہ تجویز ہے کہ اس مجلس میں تین قسم کے ممبر قرار دیئے جائیں،

(۱) وہ لوگ جو عـــہ سالانہ چندہ دینا منظور فرمائیں، اور یہی لوگ ارکین مجلس قرار دیئے جائیں گے، اور ان کو امور انتظامی مجلس میں راے دینے کا حق حاصل ہوگا، اور نیز جو کتاب یا کتابیں چھاپی جائیں گی گو کہ اون کی قیمت اون کے چندہ ممبری سے زائد ہو ان کو دی جائیں گی،

(۲) وہ اہل علم جو اس کام میں اپنی رائے اور اپنی واقفیت و تلاش سے امداد دیں، اور اس قسم کی کتابوں کو بہم پہونچائیں، اون کو یہ حق حاصل ہوگا کہ مجلس اون کو تمام تجویزات اور حالات سے وقتاً فوقتاً مطلع کرتی رہے گی اور ایک یا دو نسخہ کتاب مطبوعہ کا ان کو نذر کرے گی،

(۳) وہ لوگ جو یہ منظور کریں کہ کتاب کے چھپنے پر ایک نسخہ قیمت معینہ پر خرید لیں گے ان بزرگوں کا نام ایک رجسٹر میں درج کر لیا جائے گا، اور جو کتاب چھپے گی، اس کا ایک نسخہ اون کی خدمت میں ویلیوپے ایبل بھیجدیا جائیگا،

یہ بتا دینا بھی ضرور ہے کہ سردست جن کتابوں کا شائع کرنا پیش نظر ہے وہ پانچ روپیہ قیمت سے زیادہ کی نہیں، اس غرض کے لئے جو کتابیں اس وقت تک ہم بہم پہونچا چکے ہیں، یا جو نہایت جلد بہم پہونچ سکتی ہیں حسب ذیل ہیں،

اعجاز القرآن للامام باقلانی، طبقات الشعرا، لابن قتیبہ، مناقب الشافعی للامام الرازی مجموعہ رسائل فارابی جسمیں ۱۵ رسالے شامل ہیں تلخیص المثال ابن رشد مطبوعہ یورپ عمدہ لابن رشیق القیروانی، تاریخ صغیر امام بخاری،

ہمکو ملک کے تمام بزرگوں سے امید ہے کہ وہ اس تجویز کے بابت ہم سے خط وکتابت فرمائیں گے، اور ہم کو مطلع فرمائیں گے، کہ اون کو تین قسم کے ممبروں میں سے کس قسم کا ممبر ہونا منظور ہے، اور یہ کہ ان کے نزدیک کتب مذکورہ بالا میں سے اول کس کتاب کا شائع کرنا زیادہ مناسب ہے،

نیز ہمکو ملک کے نامور اخبارات خصوصاً آزاد، وکیل امرت سر، الوقت، پیسہ اخبار دار السلطنت سے امید ہے کہ اس تجویز کو اپنے اخبار میں چھاپ کر ہمکو ممنون فرمائیں گے،

از

آزاد لکھنؤ

۳ر اپریل ۱۸۹۶ء

انگریزی قرآن مجید کا ترجمہ

اور

ندوۃ العلماء

مسلمانوں کی جس قدر مذہبی یا دنیاوی انجمنیں قائم ہیں ان کے سالانہ اجلاسوں میں اگر ہمیشہ یہ کارروائی اختیار کیجائے کہ سب سے پہلے اس بات کا محاسبہ کیا جائے کہ پچھلے سال جو تجویزیں پیش ہوئیں، ان پر کس حد تک عمل ہوا؟ اور کس قدر باقی ہے؟ تو تمام انجمنوں کی حالت سنبھل جائے لیکن اگر کارکنانِ انجمن کسی حد تک الزام کے قابل ہیں، تو پبلک دعماعت) ان سے زیادہ مستحق ہے، کہ کبھی اس کی طرف سے بازپرس نہیں ہوتی، ریزولیوشنوں اور تجویزوں کو دیکھا جائے تو دفتر کا دفتر تیار ہو گیا ہے، لیکن عمل کا نام لیا جائے تو انگلیوں پر گننے کی نوبت آئے گی،

"ندوۃ العلما" کے متعلق بھی اسی قسم کے محاسبہ کی ضرورت ہے، لیکن چونکہ عام معمول کی طرح اس کی نسبت بھی پبلک کی طرف سے کوئی بازپرس نہیں کی گئی اس لئے ہم خود اس فرض کو ادا کرنا چاہتے ہیں، ہوا خواہانِ ندوہ کو اس سے متردد نہیں ہونا چاہئے، ارکانِ ندوہ نے اگر کچھ کیا ہے، تو ان کو داد ملے گی، اور نہیں کیا ہے تو آیندہ ان کو کرنا پڑیگا، اور یہ سرتاسر ندوہ ہی کے فائدے کی بات ہے،

"ندوۃ العلما" کا سالانہ جلسہ بہت سروسامان سے اپریل کی ابتدائی تاریخوں میں بمقام

لکھنؤ ہونے والا ہے، اس لئے ہم سب سے پہلے اس بات کی طرف متوجہ ہوتے ہیں کہ پچھلے جلسہ میں کیا کیا تجویزیں منظور ہوئی تھیں، اور ان کے متعلق کیا کیا گیا،

پچھلے ریزولیوشن حسب ذیل ہیں:-

(۱) قرآن مجید کا عمدہ و مستند ترجمہ انگریزی میں، (۲) کتب تاریخی مروجہ مدارس کی غلطیوں کی اصلاح (۳) وقف علی الاولاد کی تحریک (۴) اشاعت اسلام کی تحریک (۵) تمام اسلامی تحریکوں کا ایک مرکز قرار دینا، ان تجاویز کے متعلق مفصل رپورٹ تو عین سالانہ جلسہ میں پیش ہوگی، اور اس سے ظاہر ہوگا کہ کس حد تک کام ہوا ہے؟ اور کس حد تک نہیں، لیکن مختصراً میں ان کے متعلق اس غرض سے بیان کرتا ہوں کہ لوگ "ندوہ" کے سالانہ جلسہ میں ان کارروائیوں کے متعلق ہر قسم کے مشورہ اور نکتہ چینی کے لئے تیار ہو کر آئیں، ورنہ عین وقت پر جو خیالات اور رائیں ظاہر کیجاتی ہیں، وہ سرسری اور دفع الوقتی ہوتی ہیں،

(پہلا ریزولیوشن)

قرآن مجید کا انگریزی ترجمہ درحقیقت ایک نہایت ضروری کام ہے، یورپ کی زبانوں میں قرآن مجید کے کثرت سے ترجمے موجود ہیں، اور جدید تعلیم یافتہ ان ہی کو پڑھتے ہیں، ان ترجموں میں سخت غلطیاں ہیں، اس کے علاوہ مترجموں نے اکثر جگہ حاشیہ میں اپنی طرف سے جو کچھ لکھا ہے اس میں علانیہ قرآن مجید پر نکتہ چینیاں ہیں، مثلاً جہاں قرآن مجید میں یہ ذکر ہے کہ یہودی حضرت عزیزؑ کو خدا کہتے تھے، اس جگہ حاشیہ میں لکھا ہے، کہ "یہودیوں پر ایک افسوناک تہمت ہے"

ان اسباب سے ضرور تھا کہ انگریزی زبان میں ایک صحیح اور مکمل ترجمہ کیا جاتا، "ندوہ" کے سالانہ جلسہ میں یہ تحریک پیش ہو کر منظور ہوئی، اور خوش قسمتی سے سردار اسمٰعیل خاں سفیر کابل

نے اس غرض کے لئے پانچہزار روپیہ دینے کا وعدہ کیا ترجمہ کے لئے سب سے ضروری امر یہ تھا کہ وہ شخص انتخاب کیا جائے جو اعلیٰ درجہ کی انگریزی لکھ سکتا ہو، اور عربی زبان سے بھی اچھی طرح واقف ہو مسلمانوں میں انگریزی کا انشا پردار آج نواب سید حسین صاحب بلگرامی سے بڑھ کر کوئی نہیں ہے، اس کے ساتھ وہ عربی بھی اس قدر جانتے ہیں کہ تفسیروں سے کافی مدد لے سکتے ہیں، اس لئے ان سے درخواست کی گئی، انھوں نے "سورۂ بقرہ" کا ترجمہ کئی برس قبل کیا تھا، اس درخواست سے ان کو مزید تحریک ہوئی، اور انھوں نے لکھا کہ میں دو برس میں پورے قرآن مجید کا ترجمہ کر دونگا اون کے الفاظ یہ ہیں :-

"انشاء اللہ زندگی باقی ہے تو دو سال کے اندر ختم ہو جائیگا" سورہ بقرہ" تمام اور "آل عمران" کا معتدبہ حصہ ختم ہو چکا ہے" (مورخہ ۱۰ اپریل ۱۹۱۰ء)

نواب صاحب جس احتیاط اور پابندی کے ساتھ ترجمہ کر رہے ہیں، اور جو خصوصیتیں انھوں نے پیش نظر رکھی ہیں، ان کا اندازہ ان کے ایک خط کے اقتباس سے ہو گا جس کو میں ذیل میں نقل کرتا ہوں،

"راڈول کا ترجمہ سب سے بہتر ہے اگرچہ پھر بھی ایک نصرانی پادری کا ترجمہ ہے، میں نے اپنے ترجمے میں چند خصوصیتوں کا التزام کیا ہے، ایک یہ کہ عبارت میں روانی ایسی ہو کہ پڑھنے میں لطف آئے، دوسرے یہ کہ تفسیر کی بو بھی نہ پائی جائے، ترجمہ لفظ بلفظ ہو، تیسرے یہ کہ رشاقت الفاظ و ہمواری اصوات کا لحاظ رہے، گو کہ یہ مدّ اول سے متعلق ہے ترجمہ کی حالت یہ ہے کہ جب تک تین چار، پانچ مرتبہ نظر ثانی نہیں ہوتی تشفی نہیں ہوتی، یہ ایک مشہور بات ہے، اور ہر شخص کے نزدیک مسلّم ہے، کہ توراۃ اور انجیل کے قدیم انگریزی ترجمے کے برابر کوئی کتاب بحیثیت ادب و انشا انگریزی زبان میں نہیں ہے جہانتک

ممکن ہے اس کی تقلید کیجاتی ہے"

لیکن چونکہ مقصود یہ تھا کہ یہ ترجمہ کسی ایک شخص کی ذاتی قابلیت تک محدود نہ ہو، اس لیے اور لائق اور قابل لوگوں کی تلاش ہوئی، جو انگریزی اور عربی دونوں جانتے ہیں، سخت افسوس ہے کہ علما کے گروہ میں تو ایک شخص بھی نہ ملا، جو انگریزی جانتا ہو، اس لئے دائرۂ تلاش وسیع کرنا پڑا، اس قسم کا جامع شخص ہندوستان میں کوئی شخص مولوی حمید الدین صاحب پروفیسر عربی میور کالج سے بڑھ کر نہیں ہو سکتا، انھوں نے قدیم طریقہ پر عربی کی تعلیم پائی ہے، اور مولانا فیض الحسن سہارنپوری کے شاگرد رشید ہیں، انگریزی میں بی اے پاس ہیں، چنانچہ ان کو لکھا گیا، اور انھوں نے نہایت خلوص سے اس کام میں شرکت منظور کی، نواب عماد الملک کا ترجمہ "سورۂ بقرہ" ان کے پاس جب بھیجا گیا تو انھوں نے نمونہ کے طور پر صرف "سورۂ الحمد" کے ترجمہ پر ایک مفصل مدققانہ یادداشت لکھی، نواب عماد الملک، مولوی حمید الدین کی قابلیت سے پہلے سے واقف تھے، انھوں نے ایک خط میں مجھ کو لکھا،

"مولوی حمید الدین صاحب کی تحریر کو میں بہت عزت کی نظر سے دیکھونگا، اور جہانتک ممکن ہو گا اس کی نظر سے اصلاح کر دوں گا"

اس تحریر سے نواب صاحب کی بے نفسی اور انصاف پسندی کا بھی اندازہ ہوتا ہے، بہرحال مولوی صاحب موصوف کی یادداشت نواب عماد الملک کے پاس بھیجی گئی، انھوں نے جواب میں لکھا:

"مولوی حمید الدین صاحب کا نوٹ بھی "سورۂ الحمد" پر ملا، میں ان کے نکات کی جہاں تک ممکن ہو گا پابندی کروں گا" (مورخہ ۳ر نومبر ۱۹۱۱ء)

نواب صاحب کی احتیاط اور ذمہ داری کا یہ حال ہے کہ میں نے اون کو ایک خط میں

لکھا کہ ترجمہ کے علاوہ آپ کو ایک دیباچہ بھی لکھنا چاہیئے، جس میں تفسیر کے اُصول اور قرآن مجید مہمات مضامین سے بحث ہو، اس کے جواب میں انھوں نے مجھے لکھا،

"ایک الگ کتاب بطور مقدمہ کے لکھی جائے، تو نہایت مناسب ہوگا، لیکن لکھے گا کون؟ میں کبھی اس قسم کی جرأت نہیں کر سکتا،"

غرض نہایت احتیاط کے ساتھ نواب صاحب موصوف ترجمہ کر رہے ہیں، ان کے ولایت چلے جانے کی وجہ سے چھ مہینے کام ملتوی رہا، تاہم اس دفعہ دربار دہلی کے موقع پر انھوں نے مجھ سے بیان کیا کہ چھ سورتوں یعنی تقریبًا نو پاروں کا ترجمہ ہوگیا ہے، ان میں سے پانچ پاروں کا ترجمہ چھپ بھی گیا ہے، اور میرے پاس آگیا ہے،

نواب صاحب تنہا کام کر رہے ہیں، ان کے پاس کوئی مددگار، بلکہ محرر تک نہیں ہے، اس لئے کام دیر میں ہو رہا ہے، میں نے ان سے درخواست کی کہ کوئی مددگار ان کے پاس بھیجا جائے، اور اس کی تنخواہ یہاں سے دی جائے، نواب صاحب نے اپنے علوے ہمت کی وجہ سے منظور نہیں کیا، لیکن ایسا کرنا ضروری ہے، ورنہ کام میں سخت ہرج ہوگا، اور نواب صاحب کو مجبور کرنا چاہیئے کہ وہ اس کو قبول کریں،

مسلم گزٹ لکھنؤ

۵ رفروری سنہ ۱۹۱۲ء

مجلسِ علمِ کلام

مسلمانوں کے گذشتہ اور موجودہ زمانہ میں عجب قسم کا توارد و تشابہ ہے، عباسیوں کے زمانہ میں جب فلسفہ اور علومِ عقلیہ کا رواج ہوا، تو سینکڑوں ہزاروں اشخاص کے مذہبی عقائد متزلزل ہوگئے، آج بھی جبکہ یورپ کی تحقیقات اور خیالات قوم میں پھیل رہے ہیں، مذہبی عقائد میں ایک بھونچال سا آگیا ہے،

گذشتہ زمانہ میں جب یہ حالت پیدا ہوئی، تو فقہا اور محدثین نے یہ فتوے دیا کہ فلسفہ کا پڑھنا پڑھانا حرام ہے، آج بھی مذہبی علماء یورپ کے فلسفہ و سائنس کا سیکھنا برا سمجھتے ہیں اور علماء کے کثیر التعداد گروہ میں سے ایک شخص نے بھی یورپ کی کوئی زبان نہیں سیکھی، جس کے ذریعہ سے وہ فلسفۂ حال سے واقف ہوسکتے،

لیکن فقہا اور محدثین کا فتویٰ نہ چل سکا، ہزاروں آدمیوں نے یونانی فلسفہ پڑھا اور پڑھایا، یہاں تک کہ فلسفہ کی تعلیم عام ہوگئی، آج بھی باوجود علماء کی روک ٹوک کے انگریزی تعلیم عام ہو رہی ہے، اور یہ سیلاب کسی کے روکے سے رک نہیں سکتا،

قدیم زمانہ میں فقہا و محدثین نے گو فلسفہ کا پڑھنا اور علم کلام کا مرتب کرنا ناجائز قرار دیا لیکن ایک گروہ پیدا ہوا جس نے علم کلام پر توجہ کی، اور اس فن میں کتابیں لکھیں، یہ لوگ خود فلسفہ داں نہ تھے، لوگوں سے فلسفہ کے خیالات سن لئے تھے، اور ان ہی پر تصنیف کا

دار مدار رکھا تھا،

امام اشعری، ماتریدی، امام الحرمین، باقلانی جو علم کلام کے بانی سمجھے جاتے ہیں، ان میں ایک بھی فلسفہ داں نہ تھا، آج بھی یہی حال ہے مصر و ہندوستان میں نہایت قابل اور لائق بزرگوں نے جدید خیالات اور مسائل کے رد میں کتابیں لکھیں، اور ان کی تصنیفات جدید علم کلام کی حیثیت سے ملک میں پھیلی ہوئی ہیں، لیکن ان میں ایک بھی یورپ کی کوئی زبان نہیں جانتا، اور لطف یہ ہے کہ جو یورپ کی زبان جانتے ہیں، وہ بھی ان ہی بزرگوں کی تصنیفات کے پیرو ہیں،

یہاں تک تو قدیم و جدید واقعات میں تشابہ اور اشتراک ہے لیکن اب دونوں کی حدیں جدا ہوتی ہیں، قدیم زمانہ میں امام غزالی کے بعد علمار نے نہایت جد و جہد سے فلسفہ کی تحصیل شروع کی، چنانچہ امام رازی، محقق طوسی، شیخ الاشراق وغیرہ فلسفہ میں اس رتبہ پر پہونچے کہ خود فلسفہ دانوں کو یہ مرتبہ حاصل نہ تھا لیکن آج علمار میں سے ایک شخص بھی ایسا موجود نہیں جس نے یورپ کا فلسفہ اور سائنس حاصل کیا ہو،

اس کا نتیجہ یہ ہے کہ جدید علم کلام بالکل نامکمل اور ناقص ہے، اور اگرچہ اس کا پورا علاج تو اس وقت ہو سکتا ہے جب ہمارے علما خود یورپ کے علوم و فنون میں کمال پیدا کرلیں، لیکن چونکہ اس میں ابھی دیر نظر آتی ہے، اس لئے اس وقت جو تدبیر اختیار کیجا سکتی ہے، وہ یہ ہے کہ ایک کمیٹی قائم کیجائے جس کا نام "مجلس علم کلام" ہو،

اس کمیٹی میں قدیم علما اور جدید تعلیمیافتہ دونوں گروہ کے لوگ ممبر ہوں، قدیم علما اس بات کا فیصلہ کریں گے کہ جو عقائد اور مسائل فلسفہ کے خلاف بیان کئے جاتے ہیں، ان میں سے کون سے مسائل درحقیقت اسلام کے اصل عقائد ہیں، اور کون سے نہیں، جدید تعلیم یافتہ

گروہ اس بات کا فیصلہ کر سکے گا، کہ جن چیزوں کو فلسفہ کے مخالف کہا جاتا ہے وہ درحقیقت فلسفہ کے مخالف ہیں بھی یا نہیں، اور اگر ہیں تو فلسفہ کی تحقیقات کہاں تک یقینی اور قطعی ہے
اس کمیٹی کے لئے بزرگانِ ذیل انتخاب ہو سکتے ہیں:۔

(علمار) (۱) مولوی مفتی محمد عبد اللہ صاحب ٹونکی (۲) مولانا مولوی شیر علی صاحب حیدرآباد سابق مہتمم دار العلوم ندوہ (۳) سید محمد رشید رضا صاحب مصری ایڈیٹر "المنار"،

(جدید تعلیمیافتہ) (۱) ڈاکٹر محمد اقبال صاحب بیرسٹر (۲) مولوی حمید الدین صاحب عربی پروفیسر یونیورسٹی الہ آباد (۳) مولوی عبد القادر صاحب بی اے، بھاگلپوری،

ہم کو خوشی ہے کہ ڈاکٹر محمد اقبال صاحب نے اس مجلس کی ممبری منظور کر لی ہے اور صاحبوں نے ابھی خط کا جواب نہیں دیا، لیکن امید ہے کہ کسی کو اس عمدہ کام کی شرکت سے انکار نہ ہوگا،

ہم چاہتے ہیں کہ ملک کے اور حضرات جن کو اس تجویز سے دلچسپی ہو ہم سے خط و کتابت کریں، جلسۂ سالانہ ندوۃ العلمار میں یہ تجویز پیش کیجائے گی، اور جو فیصلہ ہوگا، اس کے مطابق عمل کیا جائے گا،

مسلم گزٹ لکھنؤ
۴ر مارچ سنہ ۱۹۱۲ء

ایک اہم تجویز

خدا کا شکر ہے کہ ملک میں تصنیف و تالیف کا مذاق پھیلتا جاتا ہے، اور قابلِ قدر ارباب کرم پیدا ہوتے جاتے ہیں، لیکن با این ہمہ اس گروہ میں زیادہ تعداد اون لوگوں کی ہے جن کو مصنف کے بجائے مضمون نگار یا انشا پرداز کہنا زیادہ موزوں ہوگا، کیونکہ ان کی مستقل تصنیفیں نہیں ہیں بلکہ معمولی رسالے یا مضامین ہیں،

اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ ان کو اعلیٰ درجہ کی تصنیف کی قابلیت نہیں، بلکہ اصل وجہ یہ ہے کہ اعلیٰ درجہ کی تصنیف کے لئے جو سامان درکار ہے وہ مہیا نہیں ہے، ان میں سے اکثر کے پاس کتابوں کا ذخیرہ نہیں، جو انتخاب اور استنباط اور اقتباس کے کام آئے، اتفاق سے اگر کوئی مقامی کتب خانہ موجود ہے تو جمعی کے اسباب نہیں کہ اطمینان سے چند روز وہاں رہ کر کتابوں کا مطالعہ اور اس سے استفادہ اور نقل و انتخاب کر سکیں، ان باتوں کے ساتھ کوئی علمی مجمع بھی نہیں کہ ایک دوسرے سے مشورہ اور مبادلۂ خیالات ہو سکے،

ان مشکلات کے حل اور تصنیف و تالیف کی ترقی کے لئے ضرور ہے کہ ایک وسیع "دار التصنیف" امورِ ذیل کے موافق قائم کیا جائے:۔

(۱) ایک عمدہ عمارت "دار التصنیف" کے نام سے قائم کی جائے، جس میں ایک وسیع ہال کتب خانہ کے لئے ہو، اور جس کے حوالی میں ان لوگوں کے قیام کے لئے

کمرے ہوں، جو یہاں رہ کر کتب خانہ سے فائدہ اٹھانا، اور تصنیف و تالیف میں مشغول رہنا چاہتے ہوں،

(۲) یہ کمرے خوبصورت اور خوش وضع ہوں، اور ان مشہور مصنفین کے نام سے موسوم ہوں، جو تصنیف کی کسی خاص شاخ کے موجد اور بانی فن ہوں،

(۳) ایک عمدہ کتب خانہ فراہم کیا جائے، جس میں کثرت تعداد ہی پر نظر نہ ہو بلکہ یہ امر بھی ملحوظ رہے کہ جس فن کی کتاب ہو، نادر اور کمیاب ہو،

(۴) تصنیفی وظائف قائم کئے جائیں، اور وظیفہ عطا کنندہ کے نام سے موسوم کیا جائے، یہ وظائف یا ماہوار ہوں گے یا کسی تصنیف و تالیف کے صلہ کے طور پر دیئے جائیں گے،

(۵) جو لوگ کم از کم پانچسو روپیہ یکمشت عطا فرمائیں گے انکے نام اس عمارت پر کندہ کئے جائیں گے، میں یہ تجویز بالکل ایک سرسری صورت میں پیش کرتا ہوں، اور چاہتا ہوں کہ سردست محض ایک خاکہ کے طور پر اس کی بنیاد قائم ہو جائے، جو رفتہ رفتہ خود بخود وسعت حاصل کرتی جائیگی، اس بات کا مجھکو اطمینان ہے کہ ریاستہاے اسلامی سے اس کے لئے ماہوار مقرر ہو سکیں گی، سردست ہمکو صرف دس ہزار روپیہ درکار ہے، جس سے ایک مختصر تعمیر کی بنیاد ڈال دیجائے، اصل فنڈ کے لئے پچاس ہزار روپیہ کا تخمینہ کیا گیا ہے،

(۶) دس ہزار کی رقم میں، میں سردست ایکہزار اپنا پیش کرتا ہوں، اور میں اس بات کا بھی مستدعی ہوں کہ جن بزرگوں کو میری تجویز سے دلچسپی ہو، مجھ سے خط و کتابت فرمائیں اور مناسب مشورہ سے میری ہمت افزائی کریں، نیز ایڈیٹران ہمدرد، وطن، پیسہ اخبار، مشرق، البشیر، وکیل وغیرہ سے درخواست ہے کہ اس تجویز کو اپنے اپنے اخبار میں شائع فرمائیں فقط

(الہلال، ۱۱ر فروری ۱۹۱۴ء)

اثبات واجب الوجود

مصنفہ

مولوی مفتی انوار الحق صاحب سکریٹری صیغہ تعلیمات ریاست بھوپال

اردو زبان میں تصنیفات کے انبار کی کیا کمی ہے جس کثرت سے دواؤں کے اشتہارات شائع ہوتے ہیں، اسی کے قریب قریب تالیفات اور تصنیفات کا شمار بھی پہونچ جاتا ہی لیکن ان میں سے ہاتھ سے چھونے کے قابل کتنی ہیں؟ اس کا جواب ایک صحیح مذاق سے مانگنا چاہئے جسمیں اخلاقی دلیری بھی ہو، اس عالم میں سالوں کے بعد کچھ اوراق پڑھنے کے قابل ہاتھ آجاتے ہیں، تو آپ خود سمجھ سکتے ہیں کہ کس قدر خوشی ہوتی ہے، ان ہی اتفاقیہ اور شاذ مثالوں کی مختصر فہرست میں یہ رسالہ بھی ہے، جو اس مضمون کا عنوان ہی،

نئے بگڑے ہوؤں کو تو یورپ کے تمام ذخیرۂ تحقیقات میں الحاد ہی الحاد نظر آتا ہے الجنس (لی الجنس یمیل) لیکن حق یہ ہے کہ ایک نقاد طالب حق کے لئے خدا پرستی کا سامان بھی جس قدر یورپ میں مل سکتا ہے، موجودہ ایشیا میں نہیں مل سکتا، یہ ظاہر ہے کہ یورپ میں اب بھی بہت سے علما اور محققین خدا کے وجود کے قائل ہیں، لیکن چونکہ یورپ میں ہر چیز پہ جدت کا رنگ ہے، اس لئے خدا کے ثبوت اور وجود کے جو دلائل وہ بیان کرتے ہیں ان سے

مختلف الصورت ہیں، جو ایک مدت سے ہم سنتے آتے ہیں، اس لئے اگر ان کو اردو زبان میں روشناس کیا جاتا تو قوم کے نئے مذاق کے لئے نہایت مفید اور کارگر ہوتے، لیکن اتنی توفیق کس کو ہی، ؟

ہم مولوی انوار الحق صاحب کو مبارکباد دیتے ہیں کہ انھوں نے نہایت ضروری خدمت انجام دی، ہم ان کی قابلیت کے بھی بے انتہا معترف ہیں، کہ انھوں نے دقیق اور پیچیدہ باتوں کو اس خوبی سے ادا کیا ہی کہ کتاب کتاب نہیں بلکہ دلچسپ افسانہ بن گئی،

مولوی صاحب موصوف، مولانا عبد اللہ ٹونکی پروفیسر یونیورسٹی لاہور کے صاحبزادے ہیں؛ (وہ زمانہ یاد آگیا جب ہم اور مولانائے ممدوح ایک ساتھ حضرت مولانا احمد علی محدث سہارن پور کے خرمن فیض سے خوشہ چینی کرتے تھے،) مولانائے موصوف نے اپنی علمی شان کی پاسداری میں اردو زبان کی کوئی خدمت نہیں کی تھی، لیکن کچھ مضائقہ نہیں، ع اگر پدر نتواند پسر تمام کند،

مولوی انوار الحق صاحب عربی اور انگریزی دونوں کے جامع ہیں، اور یہی جامعیت ہی جس نے ان سے ایسا مفید کام انجام دلایا،

اس کتاب کی قیمت ایک روپیہ ہے، اور خود مصنف سے مل سکتی ہی،

(الندوہ، جلد ۷ نمبر ۹)

ستمبر سنہ ۱۹۱۰ء مطابق رمضان سنہ ۱۳۲۸ھ

ندوۃ العلما کا گیارہواں سالانہ اجلاس

بنارس میں

اور

علمی نمائش

ہندوستان آج کل جن افکار اور خیالات میں محیط ہو رہا ہے، ان کو دیکھتے ہوئے اس امر کی توقع رکھنی کہ قوم کے قدیم علمی زر و جواہر کسی دن خود بخود چمک اٹھیں گے، بالکل ایسی بات ہے، جیسے قرونِ وسطیٰ میں ضوءِ غیر مرئی کے انکشاف کی توقع، قوم کا قدیم علمی سرمایہ بہت کچھ برباد ہو چکا ہے، اور جس قدر باقی ہے وہ بھی عنقریب قوم کی بد مذاقی پر قربان ہونیوالا ہے، اگر کسی قومی قوت کے مضبوط ہاتھوں نے ان کو اپنی حفاظت کا سہارا نہیں دیا،

ندوۃ العلما اپنے دل و دماغ میں جن مقاصد کو مدت سے چھپائے ہوئے ہے، اور جو بدقسمتی سے اس وقت تک عملی پیرایہ سے محروم رہے، ان میں ایک اہم مقصد قدیم علمی سرمایہ کی حفاظت بھی ہے، یہ سچ ہے کہ آج ہر طرف عربی اور فارسی لٹریچر کی کساد بازاری نظر آتی ہے، اور قدیم لٹریری مذاق مغربی تہذیب میں جذب ہو رہا ہے، مگر پھر بھی ہندوستان میں ایک چھوٹی سی جماعت موجود ہے جو قدیم سوسائٹی کے اثرات کا نتیجہ ہے، اور اس لئے قدیم علمی مذاق سے ناآشنا نہیں ہے، اگر ندوۃ العلما کا یہ اہم مقصد علمی دائرے میں قدم رکھے، تو یقیناً یہ جماعت

خیر مقدم کے لئے تیار ہو جائیگی،

ندوۃ العلما ابھی خود ابتدائی حالت میں ہے، موجودہ حالت کو ایک خواب سمجھنا چاہئے جس کی تعبیر گو خوش آیند ہے، مگر قوم کی توجہ کی محتاج، اور قوم کی امداد پر مشروط ہے، اس لئے درحقیقت ندوۃ العلما اپنے تمام مقاصد کو ذہنی دنیا میں محدود رکھنے پر ایک حد تک معذور بھی ہے، مگر پھر بھی اس کی اصلی کوشش یہ ہے کہ حتی الامکان اپنے تمام ارادوں کا ایک مجمل نمونہ قوم کے سامنے پیش کر دے، اور زبانِ حال سے بتلا دے کہ میری طاقت میں یہاں تک علمی کام کی کوشش ممکن تھی، مقاصد کی عمدگی دکھلا دی، ان کا عملی نمونہ بھی پیش کر دیا، نمونہ کی خوبیاں بھی ظاہر ہیں، اب قوم کا فرض ہے کہ یا تو کام کی عمدگی کا عملی اقرار کرے، یا قوم کی علمی ترقی کا دلفریب خواب ہمیشہ کے لئے دل سے بھلا دے،

بنارس کا آیندہ اجلاس درحقیقت اسی خیال کا نتیجہ ہے، ندوۃ العلما اس جلسہ میں اپنے اور مقاصد کے ساتھ اُس اہم مقصد کے متعلق بھی ایک عملی نمونہ پیش کرنا چاہتا ہے جس کا مفہوم یہ ہے کہ:

قوم کے قدیم علمی سرمایہ کی حفاظت کیجائے،

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ اجلاس کے ساتھ ایک علمی نمایش کا انتظام کیا گیا ہے جو اپنی نوعیت اور طریق نمایش کے لحاظ سے ہندوستان میں بالکل ایک نئی قسم کی نمایش ہے، اس نمایش کا مقصد یہ نہیں ہے کہ قوم کو ہندوستانی تجارت کا ایک منظر دکھلا دیا جائے یا ہندوستانی صنعت و حرفت کا ایک مینا بازار لگا دیا جائے، یہ کام ضروری ہیں، اور اس کو قوم کے اور دانشمند افراد انجام دے رہے ہیں، ندوۃ العلما کا کام قوم کی علمی و مذہبی سرمایہ کی حفاظت، اشاعت، اور ترقی ہے، اس لئے وہ ایک محض علمی نمایش کا انتظام

کرنا چاہتا ہے، سالانہ اجلاس کی کشش دور دراز مقامات سے جن لوگوں کو کشاں کشاں کھینچ لائیگی اُن کی ضیافت کے لئے ندوۃ العلما نے ایک علمی دعوت کا اہتمام کیا ہے، امید ہے کہ یہ خشک مگر نتیجہ خیز دعوت قوم کے علم دوست افراد کو محظوظ اور مسرور کرے گی،

نمایش کے مقاصد | اس نمایش کے اصلی مقاصد یہ ہیں،

(۱) عربی اور فارسی کی جو نادر الوجود قلمی کتابیں خاص خاص خاندانوں، کتب فروشوں، پرائیوٹ کتب خانوں میں محفوظ ہیں، اور جنمیں قوم کے قدیم علمی کارنامے مدفون ہیں، ان کا اجتماعی منظر قوم کے پیش نظر کر دیا جائے،

(۲) قدیم شاہی فرامین جو مسلمانوں کی قدیم تہذیب اور انشا پردازی کی یادگار ہیں، اور نہایت بے دردی سے شخصی حفاظت میں برباد ہو رہے ہیں، ان کو ایک خاص ترتیب سے جمع کیا جائے، اور ان سے کار آمد نتائج پیدا کئے جائیں،

(۳) اہم ترین مقصد یہ ہے کہ عربی اور فارسی لٹریچر کی خاص خاص شاخوں کی تاریخ مرتب کی جائے، اور اس مقصد کے لحاظ سے اُن شاخوں کی تمام موجود کتابیں جمع کی جائیں اور ان کو اس ترتیب سے یکے بعد دیگرے رکھا جائے، کہ بیک نظر عہد بعہد کی تبدیلیاں اور ترقیاں معلوم ہو جائیں، اور بغیر کسی غیر معمولی کوشش کے معلوم ہو جائے کہ ابتدا میں اس فن کی کیا حالت تھی، پھر اس کے بعد کس قسم کی تبدیلی ہوئی کیا کیا اضافے ہوئے اور موجودہ حالت میں اور اصلی حالت میں کیا فرق ہے؟ (اس مقصد کی تفصیل آگے آئیگی)

عملی کام | آیندہ اجلاس میں ان مقاصد کے لحاظ سے اشیائے ذیل کی نمایش کا انتظام کیا گیا ہے،

(۱) عربی اور فارسی کی وہ قلمی کتابیں جمع کیجائیں گی، جنمیں ذیل کی خصوصیات میں سے کوئی خصوصیت موجود ہو،

(الف) عنوان یا مضمون کے لحاظ سے جو کتابیں قابلِ قدر ہیں اور اس وقت تک حلیۂ طبع سے محروم رہیں،

(ب) قدامت کے لحاظ سے جو کتابیں تاریخی اہمیت رکھتی ہیں، جن کو تصنیف کئے ہوئے یا لکھے ہوئے ایک بڑا زمانہ گذر گیا ہے، اور اس بنا پر کسی گذشتہ زمانے کی طرز تحریر، یا طریق کتابت کا نمونہ ہیں،

(ج) خود مصنف یا مصنف کے شاگرد یا مصنف سے قریب تر زمانہ کی لکھی ہوئی ہیں، اور اس بنا پر صحت اور استناد کے لحاظ سے قابلِ نمایش ہیں،

(د) حسنِ خط کے لحاظ سے جو کتابیں قدیم مصوری اور زرنگار گلکاری کا نمونہ ہیں یا خط کی عمدگی اور حسن کے لحاظ سے بے نظیر ہیں،

(ہ) کسی خاص مشہور خوشنویس اور استاد کتابت کے قلم سے نکلی ہوئی کتابیں یا مصاحف بے بہا جیسے یاقوت مستعصم کا لکھا ہوا قرآن شریف،

(۲) شاہانِ تیموریہ کے وہ فرامین جمع کئے جائیں، جو روز بروز صفحۂ روزگار سے مٹ رہے ہیں، اور جن کے دیکھنے سے قدیم شاہی کاناموں کی تصویر آنکھوں کے سامنے آجاتی ہے،

(۳) استادانِ فن کتابت اور خوش نویسانِ قدیم کے لکھے ہوئے یادگار قطعے، طغرے اور وصلیاں جمع کیجائیں گی، جو قدیم فن خطاطی کا بہترین نمونہ ہونے کے ساتھ فن خطاطی پر نتیجہ خیز روشنی ڈالتی ہیں،

(۴) مطلا اور مذہب مرقعے فراہم کئے جائیں گے، جو قدیم فن مصوری کی زندہ یادگاریں ہیں،

فن بلاغت اور فارسی شاعری کی تاریخ اور مسلمانوں کے قدیم علمی ترقیات کی نمائش

یہ تمام سامان مقصد نمبر (۱) اور (۲) سے تعلق رکھتا ہے مگر اس علمی نمائش کا اہم اور قابل دید حصہ وہ ہوگا جو مقصد نمبر (۳) کا عملی مگر ابتدائی نمونہ ہوگا، درحقیقت نمائش کا یہ حصہ مسلمانوں کی علمی ترقیات کا ایک ایسا صاف خاکہ اور روشن نمونہ پیش نظر کردیگا جسکی اہمیت اور نوعیت کو دیکھتے ہوئے اس حصہ کو علمی نمائش سے موسوم کرنا بالکل صحیح اور بیان واقعہ ہے مقصد نمبر (۳) کا مقصد یہ ہے کہ مسلمانوں کے گذشتہ علمی کارنامے اور ترقیوں کی بغیر کسی تفصیل، استدلال، استخراج نتائج اور تحریر کے محض کتابوں کی منتظم اور مرتب صورت سے ایک مکمل تاریخ پیش کردے، آیندہ نمائش میں صرف فن بلاغت اور فارسی شاعری کو اس غرض سے انتخاب کیا ہے جن کے متعلق اس قدر ذخیرہ موجود ہے، کہ ایک مکمل تاریخ پیش کردیجائے

فارسی شاعری کی تاریخ اور اوس کی نمائش

چنانچہ فارسی شاعری کی ابتدا سے لے کر موجودہ دور تک کی مکمل تاریخ محض کتابوں کی ترتیب سے دکھلائی جائے گی فارسی شاعری نے سات سو برس میں سینکڑوں رنگ بدلے ہیں، اور ہر زمانے میں ایک خاص لباس میں جلوہ گر ہوئی ہے، ابتدائی عہد کے جو نمونے موجود ہیں، اگر ان کو موجودہ زمانہ کی شاعری سے ملایا جائے، تو عظیم الشان اختلاف محسوس ہوتا ہی، لیکن تمام آنکھیں اس اختلاف کو محسوس نہیں کرسکتیں، فکر صائب اور مذاق صحیح کی ضرورت ہی، مگر آیندہ نمائش ہر عہد کی شاعری کے نمونے ایک خاص ترتیب سے رکھکر دیکھنے والوں کو بتلا دے گی، کہ فارسی شاعری کی ابتدا میں کیا حالت تھی؟ پھر کس صورت میں جلوہ گر ہوئی؟ کیا کیا تبدیلیاں ہوئیں؟ کیا کیا اضافے ہوئے،؟ اور اب کس لباس میں جلوہ افروز ہے؟ نمائش کے اس حصے کے متعلق ایک مبسوط لیکچر اس تاریخ کی تمام باریکیاں آئینہ کردے گا، اور تیسرا کاے جلسہ جب اپنے اپنے مقاموں پر واپس جائیں گے تو ان کا پیمانہ دماغ فارسی شاعری کی محققانہ تاریخ اور فلسفہ شاعری کے دقیق رموز سے لبریز ہوگا،

اسی طرح فن بلاغت کی وہ تمام کتابیں تاریخی ترتیب سے رکھی جائیں گی جن سے اس فن کا کوئی نیا دور شروع ہوتا ہے،

آخر میں ہم اُن حضرات کو اس نمایش پر توجہ دلاتے ہیں، جن کے پاس قلمی کتابوں قطعوں وصلیوں اور فرامین کا ذخیرہ موجود ہے، اور وہ علم دوست اور فیاض طبع اشخاص کے ہاتھوں ان کو فروخت کرنا چاہتے ہیں، کہ اس قسم کی قیمتی اشیار کی فروخت کا اس نمایش سے بہتر اور کوئی ذریعہ نہیں ہوسکتا، جب کہ ہندوستان کے دور دراز مقامات کے علم دوست اور رؤسا شرکتِ جلسہ کی غرض سے اس موقع پر جمع ہوں گے، وہ تمام چیزیں جو نمایش میں پیش کرنے کی غرض سے دفتر ندوۃ العلما میں پہونچیں گی، ان کی حفاظت اور احتیاط کا ندوہ ذمہ دار ہے علمی نمایش کا اگرچہ معقول ذخیرہ موجود ہے، مگر ہم چاہتے ہیں کہ حتی الامکان نمایش کے دائرے کو اور زیادہ وسیع کیا جائے، اس لئے جن حضرات کے پرائیویٹ کتب خانوں میں اس قسم کی قابل نمایش کتابیں یا فرامین وغیرہ موجود ہیں ارکانِ ندوہ ممنون ہوں گے، اگر وہ چند دنوں کے لئے عاریۃً عنایت فرمائیں، جو نمایش کے بعد بحفاظت ان کی خدمت میں واپس کردی جائیں گی، حفاظت اور احتیاط ہمارا فرض ہے، اور خدا نہ کرے کہ ہم اپنے فرض کو بھول جائیں،

(الندوہ نمبر ۱ ج ۳)

(ماہ محرم ۱۳۲۴ھ مطابق ماہ مارچ ۱۹۰۶ء)

(تعلیمی)

ندوۃ العلما کیا کر رہا ہے

ندوۃ العلماء کا غلغلہ جس زور شور سے اٹھا، اور پھر جس افسردگی سے پست ہوگیا، دونوں باتیں بظاہر تعجب انگیز تھیں، لیکن حقیقت میں ایک بھی تعجب خیز نہیں، ابتدائی زور شور کے ضروری اسباب تھے، قوم ایک مدت سے دیکھ رہی تھی کہ قومی خیالات و حالات میں اصلاح کی سخت ضرورت ہے لیکن جن لوگوں نے یہ کام اپنے ہاتھ میں لیا چونکہ وہ رہنمایانِ مذہبی کے دائرہ سے نہ تھے، اس لئے ان کے اثر کا دائرہ بھی محدود رہا، چنانچہ تمام ہائے پکار، شور و غل کے بعد بھی قوم کے جو افراد تعلیم جدید کی طرف متوجہ ہوئے وہ صرف نوکری پیشہ لوگ تھے جن کی معاش کا تعلیم انگریزی کے سوا اور کوئی ذریعہ نہ تھا، ان کا اس طرف متوجہ ہونا روشن خیالی یا مذاقِ علمی کی وجہ سے نہ تھا، بلکہ اس لئے تھا کہ وہ یہ نہ کرتے تو کیا کرتے،

اس حالت میں پھر علماء کے حلقہ سے جب اصلاح کی آواز بلند ہوئی تو دفعۃً تمام ملک سے جو پہلے سے ہمہ تن انتظار تھا، لبیک کی صدائیں بلند ہوئیں، علماء کا حلقہ اگرچہ ابتدا میں مختصر تھا، لیکن تمام ملک نے جس خلوص اور جوش سے ان کی صدا پر خیر مقدم کہا، اسی نے اس دائرہ کو بہت وسیع کر دیا، سینکڑوں مولوی اور عالم جو ندوہ کی حقیقت کو ذرہ برابر بھی نہ سمجھتے تھے، یہ دیکھکر کہ مسجد نشینوں کی ریاست قائم ہوئی جاتی ہے، ہر طرف سے ٹوٹ پڑے

اور دو ہی تین سال کے اندر اندر اس سرے سے اس سرے تک ہر طرف ندوہ ہی ندوہ کی صدا بلند تھی، ندوہ کے سالانہ جلسوں میں مولویوں کی جس قدر تعداد جمع ہوئی حکومت اسلام کے زمانہ میں بھی کسی مجمع میں دستارِ فضیلت کے اس قدر شملے یکجا نظر نہ آئے ہوں گے،

ایشیائی قوموں کا جوش اور افسردگی دونوں فوری اور ناقابلِ اعتبار ہوتی ہیں، جن لوگوں نے ندوہ سے بڑی بڑی امیدوں کی لو لگائی تھی، دو چار برس کے بعد یہ دیکھ کر بیٹھ رہے کہ ندوہ سے نہ کوئی مذہبی سفارت چین و جاپان گئی، نہ قوم میں امام غزالی اور رازی پیدا ہوئے نہ کسی عالم نے یورپ کے علوم و فنون کے طلسم کی پردہ دری کی، قوم کے جوش اور اشتیاق میں کمی ہوئی، تو مولوی خود بخود اس طرح افسردہ ہوتے گئے، جس طرح مرثیہ خواں، آہ و بکا کے غل نہ ہونے سے ہمت ہار جاتا ہے، وہ گروہ جو تقلید پرستی یا خود غرضی کی وجہ سے پہلے ہی سے مخالف تھا، اس کو اور بھی شماتت کا موقع ہاتھ آیا، اب اقل قلیل صرف چند اشخاص رہ گئے جو ندوہ کے اصلی عناصر تھے،

نکتہ سنج پہلے ہی دن سے سمجھتے تھے کہ ندوہ کے جو کام ہیں، وہ پچھلی نسل سے جو قدیم زمانہ کی تربیت یافتہ ہے ہرگز انجام پذیر نہیں ہو سکتے، ندوہ کے کیا کیا کام تھے،

(۱) علما میں ایثارِ نفس کا پیدا کرنا،

(۲) انگریزی داں علما پیدا کرنا،

(۳) مذاقِ حال کے موافق علما کے گروہ میں مقررین اور اربابِ قلم کا پیدا کرنا،

(۴) ایسے علما کا پیدا کرنا جو غیر ممالک میں اسلام کی اشاعت کر سکیں؛

اب غور کرو کہ ہندوستان کی تمام درسگاہوں میں تربیت کا جو طریقہ ہے، یعنی دونوں وقت کسی کے دروازہ پر جا کر فقیروں کی طرح کھانا مانگ لانا، یا بڑی معراج ہوئی تو نان بائی

کی دوکان پر جا کر کھا آنا، اس سے کسی قسم کی ہمت، غیرت یا ایثارِ نفس پیدا ہو سکتا ہے، اس طریقہ کے تربیت یافتہ، صدقہ، نذر اور خیرات کے سوا اور کسی طریقہ پر زندگی بسر کرتے ہیں، کیا ان لوگوں سے کسی قسم کی بلند خیالی کی توقع ہو سکتی ہے؟

تربیت سے قطع نظر کرکے تعلیم کو لو، تعلیم میں جب تک یورپ کی کسی زبان کی تعلیم لازمی نہ قرار دیجائے اور زمانۂ موجودہ کے علوم و فنون نہ پڑھائے جائیں، اس وقت تک مذاقِ حال کے موافق، کیونکر اربابِ قلم پیدا ہو سکتے ہیں؟

اس بنا پر ندوہ کے اصلی بانیوں نے ہر طرف سے توجہ ہٹا کر صرف دار العلوم (یعنی مدرسۂ مجوزہ ندوہ) پر اپنی امیدوں کا مدار رکھا، دار العلوم میں بھی سخت دشواریاں تھیں، علمائے نصابِ قدیم میں کسی قسم کی اصلاح منظور نہیں کرتے تھے، انگریزی زبان کے جاری کرنے پر بعض معزز ارکانِ ندوہ نے اس زور کی مخالفت کی کہ کئی برس تک یہ مسئلہ مردہ ہو کر پڑا رہا، سب سے بڑی مشکل یہ تھی اور وہ اب بھی بہت کچھ باقی ہے کہ مدرسین جو ندوہ کو مل سکتے تھے، اسی قدیم لکیر کے فقیر تھے، اس لئے نئے راستہ پر اُن سے قدم نہیں رکھا جاتا، اور زور لگا کر چلائے جاتے ہیں تو پاؤں الٹی طرف پڑتا ہے،

غیر ممالک میں اشاعتِ اسلام کا کام، لوگوں نے اس قدر آسان سمجھا تھا، کہ بہت سے لوگ صرف اس وجہ سے ندوہ سے الگ ہو گئے کہ اس نے اب تک اس کام کو کیوں انجام نہیں دیا، اس الزام سے فائدہ اٹھا کر بعض کم مایہ لوگوں نے خود اس کام کا بیڑا اٹھایا، اور تبلیغ اسلام و اشاعتِ اسلام کے نام سے فنڈ کھولے، قومی دنیا بہت وسیع ہے، ایسے احمق بھی بہت نکل آتے ہیں جو بے سمجھے بوجھے ساتھ ہو لیتے ہیں، غرض چندہ جمع ہونا شروع ہوا، اور وہ تیاریاں ہونے لگیں، کہ جاپان و امریکا کا مسلمان ہونا صبح شام کی بات رہ گئی، سوءِ اتفاق سے

اسی اثنا میں جاپان کی مذہبی کانفرنس کا غل اُٹھا، اور خود شاہ جاپان کی طرف سے تمام ممالک اسلامیہ میں اس مضمون کے اعلانات شائع ہوئے کہ علمائے اسلام اس کانفرنس میں قدم رنجہ فرمائیں، اور اسلام کی حقیقت سمجھائیں، اس صدا کے ساتھ تمام ہندوستان میں سناٹا تھا، ہندوستان کو تو اپنی طرف سے پہلے ہی مایوسی تھی، لیکن مصر و شام و ایران، دور کی ڈھول تھے، اسی لئے سب کی نگاہیں اس طرف اٹھیں، مصر کے عربی اخبارات میں متعدد علما کے نام چھپے، جو معقول و منقول کے جامع تھے، اور جن کی نسبت مشتہر کیا گیا کہ وہ جاپان جا چکے یا عنقریب جانے والے ہیں، لطف یہ کہ ان علمار میں ہندوستان کے بھی متعدد علمار کا نام تھا جن کو اگرچہ ہم نہیں جانتے، لیکن خوشی کی بات ہے، کہ مصر و شام و روم جانتا ہے، انہیں ایک انگریزی خواں صاحب دہلی کے بھی تھے جن کو مصری اخبارات فیلسوف اور حکیم بتاتے ہیں، ٹرکی اور مصر سے جن لوگوں کا انتخاب ہوا ہم ان سے اچھی طرح واقف ہیں، ان میں ایک شخص بھی تفسیر و حدیث سے باخبر نہیں، کیونکہ وہاں بھی یہی مصیبت ہے کہ جدید تعلیم یافتہ علوم دینیہ سے ناواقف ہیں، اور قدیم تعلیم یافتہ مذاقِ حال سے آشنا نہیں، تاہم چونکہ انکی زبان مادری عربی ہے، اس لئے قرآن اور حدیث کا صحیح تلفظ کر سکتے ہیں، اور چونکہ زمانۂ حال کے خیالات سے واقف ہیں، اس لئے اس خدمت کو علمار کی بہ نسبت زیادہ خوبی سے انجام دے سکتے ہیں، افسوس!

کام اس فرقۂ زہاد سے اٹھا نہ کوئی — کچھ ہوئے تو یہی رندانِ قدح خوار ہوئے

بہرحال مجبوری کے لئے چاہیے جو کچھ کیا جائے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ جاپان کی فتح کرنے کے لئے سپہ سالار ایک طرف ہمارے ہاں سپاہی بھی تیار نہیں، بھولے بھالے مسلمان جو یورپ میں تبلیغ کے نام کا غل مچاتے ہیں، ان کی بعینہٖ یہ حالت ہے کہ ع

لڑتے ہیں اور ہاتھ میں تلوار بھی نہیں

جاپان سے ایک شخص نے جو ایک جاپانی اخبار کا مالک اور بہ قیاسِ غالب مسلمان ہے اخبار ترجمان کے اڈیٹر کے نام ایک خط لکھا ہے، جس کا ترجمہ اخبار حبل المتین مورخہ ۱۰ اگست ۱۹۰۷ء میں چھپا ہے، ہم اس کے اقتباسات مع ترجمہ کے نقل کرتے ہیں، جس سے ظاہر ہوگا کہ مسلمانوں کی اس علمی ناداری کا عام ماتم ہے،

چنیں عالمے و فاضلے راکہ بتواں از عہدہ این تکلیف بزرگ و وظیفۂ مہمہ برآید، ما از کجا بدست آریم و پیدا نمائیم، می دانم کہ گرچندیں صد مشعل برداشتہ و تمامی ساکن مسلمانانِ روسیہ در کنج خرابات را تجسس نمائیم چنیں عالمے را پیدا نہ کردہ و مایوس خواہیم گشت،

ایسا فاضل جو اس عظیم الشان مہم سے عہدہ برآ ہو سکے ہم کہاں سے ڈھونڈھکر لائیں، اگر روس کی تمام اسلامی آبادی اور ویرانہ میں سیکڑوں مشعل لے کر ڈھونڈھا جائے تو اس پایہ کا ایک عالم بھی نظر نہ آئے گا اور ہم کو ناامید ہونا پڑیگا،

آخر برائے ہمیں روز ہا بود کہ بعضی نویسندگان و مردمان دانشمند و بابصیرت و مآل اندیش ما استدعا می کردند و داد میزدند کہ علمائے اعلام اسلام از علوم جدیدہ و فنون متنوعہ خبردار باشند، آہ اگر ایں سخناں را وقعے گذاشتہ و گوش میدادند

اسی دن کے لئے بعض عاقبت اندیش مسلمان وادفریاد کرتے تھے، کہ ہمارے علمار کو علوم جدیدہ سے واقف رہنا چاہئے، کاش اون کی باتوں پر کسی نے کان لگایا ہوتا، اوس کی وقعت کی ہوتی،

حالا در عالم اسلام یک ہمچو عالمی

کیا تمامی اسلامی دنیا میں ایسا ایک

پیدا می شود کہ دارای علم وہنر وہمت
وجہد باشد تا بقوۂ نطق وتاثیر تبلیغات
خود دولت معظمۂ ژاپون را دعوت نماید
آیا قدر وقیمت چنیں بزرگوار از سلمانؓ
وابوذرؓ، ومقدادؓ وسایر مہاجرینؓ و
انصارؓ، کمتر می باشد، از ژاپون واسلام
می دانید چہ چیزست قالب بے روح
دین مبین اسلام را حیات مجدد میدان
وخانہ ساختۂ پیغمبر اکرم را دوبارا آباد
کردن ست،

ژاپونیاں را با احادیث واخبار نمی
تواں ہدایت کرد زیرا کہ شخص باید اول
قبولِ اسلام نماید وبعد صحت واعتبار
روایات را باور کند، ومعتقد راویان بشود
ژاپونی را نمی تواں گفت کہ ترکیب
وقامت فلاں ملک چنیں ست و
درازی خر دجّال چناں ویا غسلِ جنابت
ایں طور است وتیمم ایں طور ویا ایں
سخناں دعوت اسلام نمی شود،

عالم بھی مل سکتا ہے جو علم وہنر کے ساتھ
ہمت اور کوشش بھی رکھتا ہو تا کہ اپنے زورِ
تقریر سے جاپان کی عظیم الشان سلطنت کو اسلام کی دعوت دے
کیا ایسے عالم کی عزت، سلمانؓ وابوذرؓ
ومقدادؓ اور دیگر مہاجرین وانصار
سے کم ہو سکتی ہے، جاپان کا اسلام
لانا کیا چیز ہے؟ اسلام کے مردہ قالب
میں نئی روح پھونکنا، اور رسول اللہ
صلعم کی تعمیر کردہ عمارت کو دوبارہ
آباد کرنا ہے،

جاپان کے لوگوں کو احادیث وروایات
کے ذریعہ سے ہدایت نہیں کیجا سکتی، کیونکہ
پہلے آدمی اسلام لائے تب احادیث و
روایت کا قائل ہو سکتا ہے،
جاپانیوں کو یہ بتانا فضول ہے کہ فلاں
فرشتہ کا یہ ڈیل ڈول ہے، دجال کا
گدھا اس قدر طویل القامت ہے، غسلِ جنابت
اس طرح کیا جاتا ہے تیمم کا یہ طریقہ ہے، ان
باتوں سے تبلیغ اسلام نہیں ہو سکتی،

ژاپونیان را فقط به بیان حکمت و اسرار
قرآن مجید دعوت توان نمود تا به ثبوت
برسد که دین مبین محمدی چگونه با عقل
و حکمت موافق و با علوم و فنون مناسب
می باشد، شخصے که مدعی دعوت و ہدایت
شد لازم است که کافهٔ علوم و فنون
و حکمت و دانشے را که فعلاً در میان
ژاپونیان متداول ست بطور اکمل
و لائق بداند،

لیکن ہیہات! در مجلس اعلیٰ حضرت
میکاڈو غیر از ہادیان اسلام داعیان
مسیحی و یہودی وغیرہ نیز خواہند بود
اتمام این دعات از مکاتب عالیہ
دار الفنون ہائے بزرگ فراغت جستہ
اند که غیر از دین و آئین ملی خود در ادیان
اجنبیہ و علوم و فنون جدیدہ و حکمت
طبعیہ کاملاً مہارت دارند،

روحانیان مسیحی دربارہ دیانت اسلام
و طریقت بودا ہزاران تفتیشات

جاپانی صرف قرآن مجید کے حقائق و
اسرار کے بیان کرنے سے اسلام کی طرف
بلائے جا سکتے ہیں، جس سے یہ ثابت ہو جائے
کہ مذہب اسلام کس طرح عقل اور حکمت
کے موافق اور علوم و فنون کے مناسب
ہے، جو شخص تبلیغ اسلام کا مدعی ہو اس کے
لئے ضرور ہے، کہ ان تمام علوم و فنون
سے واقفیت رکھتا ہو، جو عملاً جاپان میں
جاری و ساری ہیں،

لیکن افسوس! میکاڈو کی مجلس میں مسلمانوں
کے علاوہ اور مذہبوں کے واعظ بھی
ہوں گے، جنھوں نے بڑی بڑی
یونیورسٹیوں میں علمی ڈگریاں حاصل
کی ہیں، اور جو دوسری قوموں
کے مذہب اور علوم و فنون جدیدہ
میں کمال رکھتے ہیں،

عیسائیوں نے اور بدھ نے مذہب
کے متعلق نہایت مدققانہ تحقیقاتیں کی ہیں،

عمیقہ بکار بردہ کتابہا جمع وتالیف کردہ
اند السنہ اسلامیہ وژاپونی راتحصیل نمودہ
اند، ولے از علمائے مسلمین کو آں عالمی
کہ درحق دین مسیح وآئین بودہ یک ورق
نوشتہ باشد،

وقتیکہ دولت وملت روس بت پرست
بودند، ولادیمر ایسو باندی شل ہمیں قسم
وی ژاپون برائے اخذ مذہب جدید
مجلسے ترتیب داد، از علمائے مسلمین نیز
دعوت کرد، عالم مسلمانے کہ از شہر قزان
آمدہ بود از مطالب حقہ ومزایائے اسلامیہ
وحکمت ہائے الہیہ فقط ہمیں حرف را
منتخب کردہ وگفت کہ خوردن گوشت
خوک حرام ست،

از قرار نگارش مورخین روس ولادیمیر
باطناً مائل بہ اسلام بود ومیخواست کہ
خود دولت روس تماماً قبول دین اسلام
نمایند، لیکن داعی قازانی از تمام شریعت
مطہرہ فقط حرمت لحم خنزیر را گفتہ وطورے

اور ان مضامین پر تصنیفیں لکھی ہیں، اسلام
اور جاپان کی زبانیں سیکھی ہیں، کیا
علمائے اسلام میں بھی کوئی ایسا شخص
ہے، جس نے حضرت عیسیٰ یا بودھا کے
متعلق ایک صفحہ لکھا ہو،

جس زمانہ میں روسی قوم بت پرست تھی،
شاہنشاہ روس ولاڈیمیر نے اسی طرح
ایک جلسہ منعقد کیا تھا، اور علمائے اسلام
کو بھی بلایا تھا، جو صاحب اس غرض کیلئے
قازان سے تشریف لائے انھوں نے
اسلام کے تمام عقائد اور فلسفہ میں سے
صرف یہ مسئلہ منتخب کرکے پیش کیا
کہ سور کا گوشت کھانا حرام ہے،

مورخین روس لکھتے ہیں کہ شاہنشاہ
روس اسلام کی طرف مائل تھا اور
چاہتا تھا کہ تمام قوم روس کیلئے مذہب اسلام
کو انتخاب کرے، لیکن قازانی عالم
نے، شریعت اسلام کے تمام احکام

اصرار نمود که جالب غیظ و لادمیر گردید تا اینکه مشارٌالیه را از مجلس خود طرد نمود و دین مسیح را قبول کرد که نود ملیون نفوس ملت روس داخل مذہب آں قسیس شدند،

حالا ای مسلمانان! انصاف کنید و فرض نمائید، ہرگاہ ایں اخوند قازانی عالم علوم ادیان و ابدان و بافضل و دانش و بیان آراستہ می بود و از حکمت و اسرار شرع شریف اطلاعات صحیحہ میداشت و بدواً در مسئلہ حرمت لحم خنزیر متوقف نگشتہ از جملات حکمیہ و محیر العقول قرآن مجید و احکام حکمت فرجام محمدی صلی اللّٰہ علیہ وآلہ وسلم کہ منافع آں بطور حسی و موافق علوم و فنون حاضر می باشد می گفت و اثبات می رسانید چہ می شد، یک صد و سی ملیون نفوس حالیہ روس تماماً مسلمان و کافہ امورات جہاں بوضعی دیگر می گردید،

میں سے صرف اس مسئلہ کو پیش کرکے اس پر اس قدر زور دیا کہ شاہنشاہ نے غصہ میں آکر ان کو نکلوا دیا، اور عیسائی مذہب قبول کر لیا، جس کا یہ نتیجہ ہوا کہ نو کروڑ آدمی دفعۃً عیسائی ہوگئے،

مسلمانو! ذرا انصاف کرو، اگر یہ قازانی ملّا، علوم دینی اور دنیوی سے واقف ہوتا، اس کو عقل اور سمجھ ہوتی شریعت کے اسرار سے مطلع ہوتا، اور ابتدا ہی میں لحم خنزیر کے مسئلہ کو نہ چھیڑتا، اور قرآن مجید کے وہ حقائق اور اسرار بیان کرتا جو عقل کو حیران کر دیتے ہیں، اور جن کے فوائد علانیہ محسوس ہوتے ہیں، اور وہ علوم موجودہ کے موافق ہیں، تو کیا نتیجہ ہوتا، یہ ہوتا کہ آج جو روس میں ۱۳ کروڑ عیسائی ہیں، یہ سب مسلمان ہوتے، اور دنیا کی تاریخ بدل جاتی،

اس مضمون سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ ہر جگہ یہ عام شکایت ہے، اور کس قدر افسوس ہے کہ مصر شام قسطنطنیہ، ایران، عرب، ایک جگہ بھی اس قسم کی تعلیم کا بندوبست نہیں کیا جاتا،

اب سوال یہ ہے کہ ندوہ نے کیا کیا، اس کا جواب جس قدر عملاً موجود ہے وہ یہ ہے کہ ندوہ نے علمائے گروہ میں کچھ خوش خیال اشخاص پیدا کئے، جو اس ضرورت کا احساس رکھتے ہیں، ورنہ اور ہر طرف تو اس گروہ میں سے اس قسم کی بھنک بھی سنائی نہیں دیتی،

ندوہ کے شور وغل کا ایک بدیہی اور علانیہ نتیجہ یہ ہوا کہ مدراس میں باقیات صالحات کے نام سے جو مشہور مدرسہ قدیم زمانہ سے چلا آتا تھا، اس میں اس سال ایک بہت بڑا جلسہ کانفرنس کی صورت میں کیا گیا، اور تمام علمانے بہ اتفاق یہ تجویز منظور کی، کہ عربی زبان کیساتھ انگریزی زبان کی تعلیم بھی لازمی قرار دیجائے، اس قدر دور دراز فاصلہ پر ندوہ کا اثر ہونا، اور خود ندوہ کے اطراف میں لوگوں کا مخالف ہونا تعجب انگیز ہے لیکن یہ ہمیشہ سے ہوتا آیا ہے، ع

زخاک مکہ ابوجہل ایں چہ بوالعجبی ست

ندوہ نے نہایت دلیری اور استقلال سے، اپنے مدرسہ میں انگریزی زبان لازمی قرار دی، اور زمانۂ حال کی تحقیقات و مسائل سے طلبہ کو آشنا کیا، اس کے ابتدائی نتائج طلبائے ندوہ کے وہ خیالات ہیں جو الندوہ کے صفحوں پر کبھی کبھی نظر آتے ہیں،

ندوہ ایک انگریزی خواں تعلیم یافتہ کو جو پنجاب کی طرف کا رہنے والا ہے، صرف اس غرض سے عربی علوم و فنون کی تعلیم دے رہا ہے کہ اس سے اشاعتِ اسلام کا کام لیا جاسکے،

اس سلسلہ میں ندوہ نے ایک بڑی کامیابی یہ حاصل کی، کہ ایک انگریز نومسلم کو جو افریقہ کا رہنے والا ہے، اور افریقہ کی تمام زبانوں میں ماہر ہے، بمبئی سے بلا کر عربی کی تعلیم دلانی شروع کی ہے، اس انگریز کا اسلامی نام شیخ محمد ہے، اور ممباسہ سے آیا ہے، وہ نہایت خلوص

سے اسلام لایا ہے، اور نہایت قانع اور بے غرض ہے اور وہ عربی تعلیم صرف اس غرض سے حاصل کر رہا ہے کہ افریقہ میں جاکر وہاں کی زبان میں اسلام کا وعظ کہہ سکے،

ندوہ نے نصاب تعلیم میں ضروری اصلاح کی، قدیم نصاب بہت کچھ بدل گیا، منطق و فلسفہ کی بے کار کتابیں نکل گئیں، تفسیر اور علم ادب کا حصہ زیادہ کر دیا گیا، انگریزی زبان کی تعلیم لازمی ہو گئی، یہ تبدیلیاں کئی برس کے بحث و مباحثہ اور رد و کد کے بعد حال میں عمل میں آئیں، اور ابھی دس بارہ برس میں ان کے نتائج کی توقع کیجا سکتی ہے،

بے شبہہ ندوہ کو جو کچھ کرنا چاہیئے اس میں سے اس نے ابھی من میں چھٹانک بھر بھی نہیں کیا، لیکن جب یہ خیال کیا جائے کہ خود اسلامی سلطنتوں میں جہاں اسلام کی شاہنشاہی قائم ہے، اس قسم کی کوشش کا شایبہ تک نظر نہیں آتا، تو جو کچھ اب تک ندوہ نے کیا ہے، اس کو کسی طرح نگاہِ حقارت سے نہیں دیکھا جا سکتا،

ابھی ہم کو یہ نہیں دیکھنا چاہیئے کہ منزل تک ہم پہنچ گئے یا نہیں بلکہ یہ دیکھنا چاہیئے کہ ہم جس راستہ پر چل رہے ہیں، وہ منزل تک جاتا ہے یا نہیں، اور یہ کہ ہم نے اس راستہ کو کچھ طے بھی کیا ہے یا نہیں،

رہرواں را خستگی راہ نیست عشق ہم راہ ست و ہم خود منزل ست

(الندوہ ج ۳ نمبر ۸)

ماہ ستمبر ۱۹۰۶ء مطابق شعبان ۱۳۲۴ھ

ندوہ کی نئی زندگی کا آغاز

ندوہ جس سروسامان سے اٹھا تھا ملک کو وہ منظر آج تک بھولا نہ ہوگا لیکن پھر جس طرح وہ رفتہ رفتہ ڈوبتا گیا، وہ بھی محتاجِ بیان نہیں یہاں تک کہ یا تو اس کے متعلق کہیں سے صدائیں نہیں اٹھتی تھی یا اٹھتی تھی تو مخالفوں کے خندۂ تحقیر کی آواز تھی،

ایسا عجیب و غریب انقلاب کیوں ہوا! کیا ندوہ درحقیقت کوئی جھوٹا طلسم تھا؟ کیا وہ خام خیالی کے دریا کا کوئی حباب تھا؟ کیا وہ طفلانہ حوصلہ مندیوں کی کوئی لہر تھی ؟

نہیں یہ کچھ نہ تھا، ندوہ ایک اصلی سچائی تھی، ایک حقیقی زندگی تھی، ایک قومی روح تھی لیکن جس طرح آفتاب بہ ایں ضیا گستری و عالمگیری کبھی کبھی گہنا جاتا ہے، ندوہ پر بھی یہ روزِ بد گذرا جس پر دشمنوں نے مسرت اور دوستوں نے افسوس کیا لیکن خدا کا شکر ہے کہ وہ آفتابِ عالمتاب اب گہن سے نکلتا آتا ہے، اور دنیا چند روز میں دیکھ لے گی، کہ قوم کا مذہبی افق نور سے معمور ہو گیا ہے اور اگر یہ نور کسی کسی کو نظر نہ آئے تو ع چشمۂ آفتاب را چہ گناہ،

ندوہ کی اس نئی زندگی میں جن جن کاموں کا آغاز ہوا یعنی نصابِ تعلیم کا تغیر، طریقۂ تعلیم کی اصلاح، بورڈروں کی تربیت، طلبہ کی قابلیتِ علمی کا ظہور، مالی حالت کی ترقی، سرمایہ تعمیر کی بنیاد گو یہ سب چیزیں ندوہ کے عمدہ مظاہرِ زندگی ہیں لیکن سب سے بڑی اور سب سے مقدم کامیابی

جو حاصل ہوئی وہ ندوہ کی سلسلۂ عمارت کے لئے زمین کا ملنا ہے،

لکھنؤ میں (جو ندوہ کا صدر مقام ہے) ایک ایسے وسیع اور خوش منظر قطعۂ زمین کا ہاتھ آنا جیسا کہ ندوہ کی وسیع کارروائیوں کے لئے درکار تھا، قریبًا ناممکن تھا، اس زمین کے لئے جو خصوصیتیں درکار تھیں حسب ذیل تھیں،

(۱) کم از کم اس کا رقبہ ۳۰-۴۰ بیگہ پختہ ہو اور ایسے موقع پر ہو کہ آیندہ اضافہ کی گنجایش ہو،

(۲) نہایت خوش منظر اور خوش فضا ہو،

(۳) شہر سے نہ دور ہو نہ قریب یعنی باہم اور بے ہمہ ہو،

(۴) سب سے بڑھ کر یہ کہ مفت ہاتھ آئے، (یہ شرط تم سمجھ سکتے ہو کہ سب سے بڑھ کر مشکل تھی) دس برس ہو چکے کہ اس قسم کی زمین کی تلاش میں ہر قسم کی کوششیں صرف ہوئیں لیکن یہ ظاہر ہے کہ ہم کیمیا ڈھونڈھتے تھے جو پہلے زمانہ میں تو ملتی تھی لیکن اب تو یورپ والوں نے اسکو دنیا سے گم کر دیا،

مشکل اور سخت مشکل یہ تھی کہ اس کیمیا کے بغیر کسی قسم کا کوئی کام انجام نہیں پا سکتا تھا، ندوہ کے قدردان اور خاص خاص احباب اپنی فیاضیوں کے امتحان دینے کے لئے مستعد تھے لیکن ہمارے پاس ان کی زر افشانیوں کے سمیٹنے کے لئے دامن نہ تھا،

دور دور سے طلبہ آنے کے لئے درخواست کرتے تھے، لیکن ہم اُن مہمانوں کو کہاں ٹھہراتے کتب خانہ روز بروز وسیع ہوتا جاتا تھا، لیکن ان علمی ممبروں کو بیٹھنے کی جگہ نہیں ملتی تھی،

تعلیم کی متعدد ضروری شاخیں اس لئے نہیں کھولی جا سکتی تھیں کہ عمارت کا لبریز پیالہ ایک قطرہ پڑنے سے بھی چھلک جاتا تھا،

خدا کا شکر اور ہزار شکر ہے کہ ان تمام مشکلات کو گورنمنٹ کی ایک نظرِ عنایت نے دفعۃً حل کر دیا، گورنمنٹ نے محض برائے نام لگان پر، ۳۲ بیگہ کا ایک وسیع قطعۂ زمین عنایت کیا،

جو لکھنؤ میں سب سے بڑھکر خوش منظر اور خوش فضا مقام ہے،

سامنے دریا، چاروں طرف کھلا ہوا میدان، عقب میں کیننگ کالج کا خوشنما بورڈنگ چاروں طرف کی زمین سے زیادہ بلند اور ہموار اور مسطح عرض ایک ایسا قطعہ ہے کہ اگر ہم اپنی آرزوں اور خواہشوں کے موافق کوئی زمین تصنیف بھی کرتے تو یہی ہوتی،

ارکانِ ندوہ پر خصوصاً اور عام مسلمانوں پر عموماً فرض ہے کہ گورنمنٹ کے شکریہ کیلئے جابجا جلسے کریں، اور گورنمنٹ کو جتائیں کہ وہ گورنمنٹ کے اس عطیہ کے کس قدر شکر گذار ہیں

اے ارکان ندوہ! اے بہی خواہانِ ندوہ! اے عام اربابِ اسلام! گورنمنٹ نے باوجود اجنبیتِ مذہب آپ کے خاص مذہبی کام کے لئے اس قدر بڑی فیاضی کی جس سے اسکو صریح مالی نقصان اٹھانا پڑا! اب آپ کا کیا فرض ہے مجھ سے بہتر آپ خود بتا سکتے ہیں، بتانے کی یہ صورت ہے کہ آپ اسی کے ذیل میں خاتونوں کے نام کی ایک اپیل پڑھیں اور سادہ جگہ کو کچھ اعداد سے پر کریں،

(الندوہ ج ۵ نمبر ۷

(اگست سنہ ۱۹۰۸ء مطابق رجب المرجب سنہ ۱۳۲۶ھ)

خاتونانِ قوم کی عزت اور یادگار

اسلام نے عورتوں کو جو عزت اور عظمت دی اس پر اگرچہ مسلمانوں نے اپنے طرزِ عمل سے پردہ ڈال دیا لیکن مذہبی روایات اور تاریخی واقعات کو کوئی شخص مٹا نہیں سکتا۔ سب سے پہلے جیسا کہ صحیح بخاری میں ہے جب آنحضرت صلعم پر وحی آئی اور ناموسِ الٰہی نے آپ کو آغوش میں لیکر فشار دیا، تو مقتضائے بشریت سے آپ کو خوف پیدا ہوا، اور آپ نے فرمایا "خشیت علی نفسی" اُس وقت حضرت خدیجۃ الکبریٰؓ نے آپ کو تسلی دی اور کہا، "لا یخزیک اللّٰہ ابدا"،

مذہبی شعائر اور مذہبی اصطلاحات میں عورتوں کا خاص حصہ ہے، جو مردوں کو نصیب نہیں حج کا ایک بڑا رکن صفا اور مروہ میں دوڑنا حضرت ہاجرہؓ کی تقلید ہے، مکہ اسلام کی جڑ ہے اسکو خدا نے قرآن مجید میں ام القریٰ کہا ہے، اسی طرح قرآن مجید میں جو آیات محکمات ہیں انکو خدا نے ام الکتاب فرمایا ہے، کعبہ کو حرم کہتے ہیں اور خواتین کا بھی یہی لقب قرار پایا ہے، قرآن مجید میں ایک مستقل سورۃ النساء عورتوں کے احکام میں اور اُن کے نام سے اُتری مردوں کے نام پر کوئی سورت نہیں ہے، کیا ان امور سے صاف یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ مذہب اور شعائر مذہب میں عورتوں کو ایک مخصوص اور ممتاز درجہ حاصل ہے، اسی کا اثر ہے کہ مذہبی احساس مذہبی خلوص، مذہبی شیفتگی جس قدر عورتوں میں پائی جاتی ہے، مردوں میں اس کا عشر عشیر بھی

نہیں اور یہ کہنا بالکل سچ ہے کہ گو آج ہم میں شبلی اور جنید نہیں لیکن رابعہ اور مریم اب بھی موجود ہیں

ان وجوہ کی بنا پر یہ نہایت مناسب بلکہ نہایت ضروری ہے کہ آج ہندوستان میں جہاں بہت سے بڑے بڑے قومی اور ملکی کام چھڑے ہوئے ہیں، ایک خالص مذہبی کام صرف خواتین کے ہاتھوں سے انجام پائے، اس کا ایک اتفاقی موقع خود بخود غیب سے پیدا ہوگیا ہے، جس میں تھوڑی ہی سی کوشش کی اور ضرورت رہ گئی ہے، ندوۃ العلما کا دار العلوم جس کا مقصد قرآن مجید، حدیث اور اسلامی علوم کو زندہ رکھنا ہے، بالکل خاص مذہبی کام ہے اس کے وجود اور بقا میں بڑا حصہ مستورات کا ہے، سب سے پہلے اس کے مصارف کیلئے جو جائداد وقف کی گئیں، وہ معزز خاتونان قوم نے کیں، پھر حضور سرکار عالیہ ریاست بھوپال خلد اللہ تعالی نے چھ سو روپئے سالانہ کی رقم مقرر فرمائی، لیکن دار العلوم کی عمارت کا اب تک کوئی سامان نہ تھا، اور موجودہ عمارت بالکل ناکافی اور ناموزوں تھی، محض تائید غیبی تھی کہ حضور ہز ہائنس جناب نواب صاحب ریاست بہاولپور کی جدہ ماجدہ خلدہا اللہ تعالی نے خاص عمارت دار العلوم کے لئے پچاس ہزار روپیہ کی رقم عنایت فرمائی،

درس گاہ کے علاوہ باقی عمارت یعنی دار الاقامہ اور کتب خانہ وغیرہ کے لئے ایک لاکھ اور درکار ہے، ہماری خواہش ہے کہ عمارت کا یہ حصہ بھی تمام تر صرف خواتین کے زر عطیہ سے انجام پائے، تاکہ تمام دنیا میں، بلکہ تمام تاریخ اسلام میں یہ نئی نظیر ہو کہ ایک مذہبی کام اور مذہبی تعمیر سر تا سر صرف خواتین کی فیاضی سے انجام پائی، اگر یہ تجویز وقوع میں آئی تو خواتین کی ابدی عزت، ابدی عظمت، ابدی شہرت کی یہ وہ یادگار ہوگی جس کی نظیر سے تمام دنیا کی تاریخ خالی ہے،

اے خاتونانِ اسلام، اے معزز ماؤ، اے محترم بہنو! اے عزیز لڑکیو! کیا اس خفیف رقم کے بدلہ میں تم خدا کی خوشی، رسول عربی کی رضامندی، قیامت کی نجات، اور قوم کی دعائیں نہیں خریدنا چاہتی ہو، (حاشا تمھاری نسبت کون یہ بدگمانی کرسکتا ہے)

یارب ایں آرزوے من چہ خوش ست
تو بدیں آرزو مرا برساں،

(الندوہ ج ۵ نمبر ۷)
اگست ۱۹۰۸ء مطابق رجب المرجب ۱۳۲۶ھ

زبیدہ خاتون

مسلمانوں کے اوصاف کے بیان میں ہمکو مجبوراً ہمیشہ پچھلے زمانہ کی طرف رجوع کرنا پڑا ہے، بلند ہمتی، دریا دلی، علم پرستی، بہادری، ایک ایک چیز کے لئے ہارون الرشید، مامونؔ زبیدہ خاتون، برامکہ اور تیموریہ کا نام لیتے لیتے ہم تھک چکے، کیا موجودہ زمانے میں ہم کو کوئی شخص اس پرانے آموختہ سے بے نیاز نہیں کرسکتا،؟ اس پُرحسرت سوال کے جواب میں ریاست بھاولپور کے افق سے ایک صدا بلند ہوتی ہے،

جناب معلی القاب رکن الدولہ نصرت جنگ حافظ الملک مخلص الدولہ

ہز ہائنس نواب حاجی صادق محمد خان صاحب جانشین خامس ادام اقبالہٗ

کی

"جدّہ مکرمہ فلک احتجاب عصمت مآب خلدہا اللہ تعالیٰ"

نے

"اپنی جیب خاص سے مبلغ پچاس ہزار روپئے دار العلوم ندوۃ العلماء کی عمارت کی تعمیر کے لئے عطا فرمائے"

ہندوستان میں ہر طرف اور بھی بہت سے علمی اور قومی کام ہیں، لیکن ان کے ارکان صاحب اثر، صاحب اقتدار، صاحب وجاہت ہیں، اور اس وجہ سے ان کی کامیابی محل تعجب

نہیں لیکن یہ عطیہ ایک ایسا عطیہ ہے جس کے وجود میں خالص اسلامی ہمدردی، خالص فیاضی
خالص دریا دلی کے سوا کوئی چیز شریک نہیں، ندوہ کی جماعت گوشہ نشینوں اور یا شکستہ لوگوں
کی جماعت ہے، اس کا دستِ طلب کسی دامن پر بے باکانہ اور مدعیانہ نہیں پڑ سکتا اس
حالت میں جو دریا دل اس کی طرف متوجہ ہو، محض اس کی بے لاگ فیاضی اور خدا پرستی ہے،

دار العلوم ندوہ کی تعلیمی حالت جس طرح ترقی کر رہی ہے اس کے لحاظ سے دار العلوم
کی موجودہ عمارت نہ صرف ناکافی تھی، بلکہ اُس کی تمام آیندہ ترقیوں کی سدِّ راہ تھی، نہ
طلبہ کے رہنے کے لئے موزوں مکانات تھے، نہ درس کے لئے کافی کمرے تھے، نہ کتب خانہ کی
گنجایش کے لئے عمارت تھی، نہ علومِ جدیدہ کی تعلیم کا سامان تھا، کوئی شخص جو ندوہ کا مشہور
اور بلند نام سنکر آتا تھا عمارت کو دیکھ کر دفعۃً اس کے تمام خیالات پست ہوجاتے تھے،
جناب خاتون محترمہ موصوفہ نے جو فیاضی فرمائی ہے اس نے دار العلوم ندوہ کی نہ صرف
بنیاد مستحکم کر دی ہے، بلکہ اس کی تمام آیندہ ترقیوں کے لئے راستہ صاف کر دیا ہے
اور گو آیندہ ندوہ کسی حد تک بڑھے، اور کتنی ہی ترقی کر جائے، لیکن انصاف یہ
ہے کہ جو کچھ ہوگا اسی فیاضی کا پرتو، اسی تخم کا ثمر، اسی آفتاب کی شعاعیں ہوں گی
اے صوبہ الہ آباد، اے اودھ! تو نہایت وسیع، نہایت ممتاز، نہایت معزز ملک ہے،
لیکن سچ یہ ہے، اور اب اس سے خود تجھکو انکار نہیں کرنا چاہئے، کہ پنجاب نہیں، بلکہ اس کی
ایک ریاست نہیں، بلکہ اُس کی ایک خاتون محترم کے آگے تیری گردن ہمیشہ کے لئے جھک گئی
تو نے کبھی برہان الملک اور آصف الدولہ پیدا کئے ہوں گے، لیکن تو کسی بیدہ خاتون
کا نام نہیں لے سکتا، ؎

این سعادت بزورِ بازو نیست　　　تا نہ بخشد خدائے بخشندہ،

ہمکو ان بزرگوں یعنی جناب مولوی رحیم بخش صاحب پریسیڈنٹ کونسل و تمام ممبر صاجان کونسل اور جناب مولوی محمد الدین صاحب ڈائرکٹر تعلیمات اور جناب ڈاکٹر مولوی محمد الدین صاحب کا بھی دل سے شکریہ ادا کرنا چاہئے جن کی وجہ سے ہماری درخواست جنابہ خاتون صاحبہ محترمہ کے سمع مبارک میں پہنچ سکی ہمکو مولوی غلام محمد صاحب شملوی کا بھی دل سے شکریہ ادا کرنا چاہئے جنھوں نے ندوہ کی آواز وہاں تک پہنچائی ہے،

(الندوہ)

ایک مذہبی یونیورسٹی

یعنی

دارالعلوم ندوۃ العلما

کے

سنگ بنیاد کا جلسہ اور جلسہ سالانہ ندوۃ العلما

ندوۃ العلما کے ہوا خواہ خصوصاً، اور بہی خواہانِ اسلام عموماً ایک مدت سے جس چیز کا انتظار کر رہے تھے، خدا کا شکر ہے کہ اب اس کے سامان مہیا ہونے کے دن آ گئے،

ندوۃ العلما کے مقاصد اور اغراض کے انجام دینے کے لئے اُن علما کی ضرورت ہے جو موجودہ زمانہ کی ضرورتوں اور خیالات سے واقف ہوں، جو یورپ کی کسی زبان سے آشنا ہوں، جو غنی النفس ہوں جنہیں ایثار نفس کا مادہ ہو، یہ اوصاف اس وقت پیدا ہو سکتے ہیں جب طلبہ کو ایک خاص طریقہ پر تعلیم اور تعلیم کے ساتھ خاص طرح کی تربیت دیجائے ندوہ کے دار العلوم نے اس کام کو شروع کیا، لیکن عمارت کے ناکافی اور ناموزوں ہونے سے نہ طلبہ کے قیام کا انتظام ہو سکتا تھا، نہ تعلیم و تربیت کی وقتیں حل ہوتی تھیں، اس بنا پر اس سال ایک نہایت خوش منظر قطعۂ زمین انتخاب کیا گیا جس کو

گورنمنٹ نے نہایت فیاضی سے (برائے نام لگان پر) اس غرض کے لئے عنایت کیا،
۲۸ نومبر ۱۹۰۸ء کو سنگِ بنیاد رکھے جانے کی رسم قرار پائی، اور نہایت خوشی اور مسرت کا
مقام ہے کہ جناب لفٹنٹ گورنر بہادر صوبہ الہ آباد نے اپنے ہاتھ سے سنگِ بنیاد کا
رکھنا منظور کیا، یہ بھی قرار پایا کہ ان ہی تاریخوں میں (یعنی ۲۹، ۳۰ نومبر ۱۹۰۸ء) ندوہ کا سالانہ
جلسہ بھی کیا جائے، یہ بات خاص طرح پر ظاہر کرنے کے قابل ہے کہ مدت سے ندوہ کے اور
دیگر وسیع اہم مقاصد میں سے صرف تعلیم پر توجہ محدود کردی گئی تھی، اب جب کہ تعلیم کے انتظام سے
کسی قدر اطمینان ہوا تو ندوہ کے اور بڑے بڑے مقاصد پر توجہ کرنے کا وقت آیا، اس لئے
ہم تمام بہی خواہانِ اسلام سے درخواست کرتے ہیں کہ اس موقع پر جب کہ ایک درسگاہ اعظم کی
بنیاد رکھی جائے گی، آپ کا تشریف لانا نہ صرف اس لئے ضرور ہے کہ ایک ایسے رسم کا شان
وشوکت سے ادا ہونا قوم کی اور اسلام کی عزت ہے، بلکہ اس لئے بھی کہ ان جلسوں میں ندوہ کے
اور بڑے مقاصد اور اغراض پر مشورہ اور مباحثہ ہوگا، اور اُن کے متعلق تجویزیں اور رزولیوشن
پیش ہونگے مشہور اور نامور علما خطبہ اور وعظ بیان کریں گے، دار العلوم ندوہ کے طلبہ کی تعلیم
اور لیاقت کا امتحان ہوگا، اس بنا پر آپ ضرور تکلیف فرمائیں، اور غور کریں کہ ہمکو مذہب اسلام
اور علوم اسلام کی بقا اور حفاظت اور اشاعت کے لئے کیا کیا تدبیریں کرنی چاہئیں،

وقفِ اولاد کا مسئلہ جو چھڑ کر چند روز کے لئے ملتوی ہو گیا تھا، اسکی کارروائی کے
مستحکم طریقہ سے جاری کرنے کا اس سے عمدہ موقع نہیں مل سکتا،

(الندوہ جلد ۵ نمبر ۹)
رمضان ۱۳۲۶ھ مطابق ۱۵ اکتوبر ۱۹۰۸ء

دار العلوم ندوۃ العلما

کے

سنگ بنیاد کا عظیم الشان جلسہ

بگذر ازیں حرف و مکرر مپرس — خواب خوشی دیدم و دیگر مپرس
تندے بود احسن رابم ہنوز — دیدۂ من باز و بجز ابم ہنوز

ہماری آنکھوں نے حیرت فزا تماشا گاہوں کی دلفریبیاں بارہا دیکھی ہیں، جاہ و جلال کا منظر بھی اکثر نظر سے گذرا ہے، کانفرنسوں اور انجمنوں کا جوش و خروش بھی ہم دیکھ چکے ہیں، وعظ و پند کے پر اثر جلسے بھی ہمکو متاثر کر چکے ہیں، لیکن اس موقع پر جو کچھ آنکھوں نے دیکھا، وہ ان سب سے بالاتر، ان سب سے عجیب تر، ان سب سے حیرت انگیز تھا،

یہ پہلا ہی موقع تھا، کہ ترکی ٹوپیاں اور عمامے دوش بدوش نظر آتے تھے، یہ پہلا ہی موقع تھا کہ مقدس علما عیسائی فرماں روا کے سامنے دلی تشکر گذاری کے ساتھ ادب سے خم تھے، یہ پہلا ہی موقع تھا کہ شیعہ و سنی ایک مذہبی تعلیم گاہ کی رسم ادا کرنے میں برابر کے شریک تھے، یہ پہلا ہی موقع تھا کہ ایک مذہبی درس گاہ کا سنگ بنیاد ایک غیر مذہب کے ہاتھ سے رکھا جاتا تھا، (مسجد نبوی کا منبر بھی ایک نصرانی نے بنایا تھا) غرض یہ پہلا ہی موقع تھا کہ ایک مذہبی

سقف کے نیچے، نصرانی، مسلمان، شیعہ، سنی، حنفی، وہابی، رند، زاہد، صوفی، واعظ، خرقہ پوش اور کجکلاہ سب جمع تھے، مصرع

آباد ایک گھر ہو جہانِ خراب میں

ہز آنر لفٹننٹ گورنر بہادر ممالک متحدہ نے منظور فرمایا تھا کہ وہ دارالعلوم ندوۃ العلماء کا سنگِ بنیاد اپنے ہاتھ سے رکھیں گے، یہ تقریب ۲۸ نومبر ۱۹۰۸ء کو عمل میں آئی، چونکہ ندوہ کا سالانہ جلسہ بھی ان ہی تاریخوں میں ہونے والا تھا، اس لئے دو طرفہ کشش کی وجہ سے گویا تمام ہندوستان امنڈ آیا، افسوس یہ ہے، کہ یہ کوئی تعطیل کا زمانہ نہ تھا ورنہ شاید منتظمین جلسہ انتظام مہمانداری میں ہمت ہار جاتے، معزز شرکائے جلسہ میں علماء میں سے مولوی مولانا عبدالباری صاحب فرنگی محلی مولوی شاہ ابوالخیر صاحب غازیپوری، مولانا ذاکر حسین صاحب، مولوی ابن حسن صاحب مجتہد العصر، مولوی شاہ سلیمان صاحب پھلواڑی، مولوی نظام الدین صاحب جھجری، مولوی مسیح الزمان خان صاحب استاد حضور نظام، اور اربابِ وجاہت میں سے جناب آنریبل راجہ صاحب محمود آباد، جناب سر راجہ صاحب جہانگیر آباد، نواب وقار الملک، کرنیل عبدالمجید خان فارن منسٹر پٹیالہ صاحبزادہ آفتاب احمد خاں، شیخ عبدالقادر بیرسٹر، حاجی محمد موسیٰ خانصاحب رئیس علی گڑھ، خان بہادر سید جعفر حسین صاحب، مولوی محمد حسین صاحب مقبہ رئیس بمبئی، بابو نظام الدین رئیس امرتسر، حاجی شمس الدین صاحب سکریٹری حمایت اسلام لاہور، مرزا ظفر اللہ خانصاحب سب جج جالندھر، شیخ سلطان احمد رئیس ہوشیار پور، خان بہادر شیخ غلام صادق صاحب رئیس امرتسر، راجہ نوشاد علی خاں صاحب، صفی الدولہ نواب علی حسن خاں لکھنؤ، حافظ نذر الرحمن صاحب رئیس عظیم آباد جلسہ میں شریک تھے

تین بجے سے ذرا پہلے تمام لوگ بہ اسلوب بیٹھ گئے، اور ارکانِ انتظامیہ ندوہ ہز آنر

کے استقبال کے لئے لب فرش دورویہ صف باندھ کر کھڑے ہوئے، کمشنر صاحب لکھنؤ نے سکریٹری دار العلوم (شبلی نعمانی) کو لفٹنٹ گورنر صاحب بہادر سے ملایا، اور پھر سکریٹری موصوف نے تمام ارکان انتظامیہ کا ایک ایک کر کے لفٹنٹ گورنر سے تعارف کرایا، ہز آنر سرخ بانات کے خیمہ میں لیڈی صاحبہ کے ساتھ چاندی کی کرسی پر رونق افروز ہوئے اول دار العلوم کے قاری نے قرآن مجید کی چند آیتیں تلاوت کیں۔ شاہ سلیمان صاحب پھلواری نے ہز آنر سے اڈریس پڑھنے کی اجازت طلب کی، مولوی مشیر حسین صاحب قدوائی نے اڈریس پڑھا، ہز آنر نے نہایت خوش لہجگی اور صفائی سے اڈریس کا جواب دیا، مولوی خلیل الرحمٰن صاحب نے عربی اڈریس جو ساٹن پر چھپا ہوا تھا، زریں کار چوبی خریطہ میں رکھکر پیش کیا، ہز آنر نے خود اپنے ہاتھ میں لے کر اڈیکانگ کے حوالے کیا، پھر سنگ بنیاد نصب کرنے کے لئے تشریف لیگئے اور مولوی شاہ ابو الخیر صاحب، کرنیل عبد المجید خاں صاحب، آنریبل راجہ صاحب محمود آباد، نواب وقار الملک، حافظ عبد الحلیم صاحب رئیس کانپور، نواب علی حسن خانصاحب رئیس بھوپال، منشی احتشام علی صاحب رئیس کاکوری، منشی اظہر علی صاحب بی اے، وکیل لکھنؤ، حکیم عبد العزیز صاحب، حکیم عبد الوالی صاحب، مولوی محمد نسیم صاحب وکیل، ان کے ساتھ گئے تھے، سنگ بنیاد کے نصب کرنے کے وقت دوبارہ قاری صاحب نے قرآن مجید کی تلاوت کی، واپسی کے وقت ارکان انتظامیہ نے موٹر کار تک مشایعت کی، اور یہ دلفریب تماشا ختم ہو گیا،

(الندوہ جلد ۵ نمبر ۱۱)

ذیقعدہ ۱۳۲۶ھ مطابق دسمبر ۱۹۰۸ء

—————— ○ ——————

ایک مذہبی مدرسۂ اعظم کی عمارت

کیلئے

تمام ہندوستان کے مسلمانوں سے درخواست

تمام ہندوستان میں ایک بھی ایسا خالص دینی اور مذہبی مدرسہ نہیں، جو بلحاظ جامعیت و وسعت و عظمت کے مدرسۂ اعظم کہلانے کا مستحق ہو، یعنی

جس میں تمام علوم دینیہ یعنی تفسیر، حدیث، فقہ، اصول کی تعلیم ایسے کمال کے درجہ تک دیجاتی ہو، کہ تحقیق کا مرتبہ حاصل ہو سکے،

جسمیں اسلامی علوم کی تمام قدیم اور نادر اور کمیاب کتابیں فراہم کی گئی ہوں،

جس میں طالب علموں کو تصنیف و تالیف کی تعلیم دیجاتی ہو،

جس میں ایسے لوگ تیار کئے جاتے ہوں جو مخالفینِ مذہب کے اعتراضات کا جواب آجکل کے مذاق کے موافق دے سکیں،

جس میں حکومت موجودہ کی زبان بھی بقدر ضرورت پڑھائی جاتی ہو،

جس کی عمارت وسیع، پرفضا اور عظیم الشان ہو،

ہندوستان میں چھ کرور مسلمان ہیں، ان کی سینکڑوں دنیوی تعلیم گاہیں ہیں،

سیکڑوں چھوٹے چھوٹے مدرسے ہیں، لیکن ایک بھی مذہبی مدرسۂ اعظم نہیں ہے، یہ کس قدر افسوس اور شرم کی بات ہے،

اس غرض کے پورا کرنے کے لئے لکھنؤ میں ندوۃ کا دار العلوم قائم کیا گیا، اور اگرچہ ابھی اس کا محض خاکہ تیار ہوا ہے، لیکن جو ضرورتیں اوپر بیان کی گئیں، ان سب کی داغ بیل ڈال دی گئی ہے، تمام مذہبی اور عربی علوم کی تعلیم ہوتی ہے، عربی کی زبان دانی اس درجہ تک سکھائی جاتی ہے کہ طلبہ برجستہ بڑے بڑے جلسوں میں عربی زبان میں لکچر دے سکتے ہیں، تصنیف و تالیف کی مشق کرائی جاتی ہے، جس کا اندازہ طلبہ کے لکھے ہوئے مضامین سے ہو سکتا ہے، جو الندوہ میں شائع ہوتے رہتے ہیں،

علوم جدیدہ اور حکومت موجودہ کی زبان بھی بقدر ضرورت سکھائی جاتی ہے،

یہ تمام امور ابھی ابتدائی پیمانے پر ہیں، اور کوشش ہے کہ اعلیٰ درجہ کی حد تک پہونچ جائیں لیکن نہایت افسوس ہے کہ عمارت نہایت پست حالت میں ہے، رفعت اور عظمت ایک طرف طالب علموں کے رہنے کی بھی گنجایش نہیں،

عمارت کا جو نقشہ تجویز کیا گیا ہے، اس کی یہ قطع ہے کہ چاروں طرف طالب العلموں کے رہنے کے مکانات بیچ میں مدرسہ کی عمارت، اور ایک طرف عظیم الشان مسجد ہوگی،

تمام علوم کے درس کے لئے الگ الگ کمرے ہوں گے، یعنی تفسیر کے لئے جدا، حدیث کے لئے جدا، فقہ کے لئے جدا، ادب کے لئے جدا، اور علی ہذا القیاس، یہ کمرے ان ہی علوم کے نام سے موسوم ہوں گے مثلاً دار التفسیر، دار الحدیث، دار الفقہ وغیرہ وغیرہ،

جو رئیس یا امیر جس کمرے کی تعمیر اپنے صرف سے کرائیں گے، اس کمرے کی پیشانی پر اُن کا نام کندہ ہوگا، اور اس طرح ابد الآباد تک یہ خیر جاری ان کے نام سے قائم رہے گی،

جو کمرہ عام چندہ سے تیار ہوگا، ان پر ان اشخاص کے نام کندہ کئے جائیں گے جو کم از کم سو روپیہ عطیہ دیں گے،

چونکہ یہ عمارت ایک عظیم الشان عمارت ہوگی جس کا تخمینہ (مسجد کے علاوہ) پچاس ہزار سے کم نہیں ہوسکتا، اس لئے ندوہ کی طرف سے ہم چند ارکان نے ارادہ کیا ہے کہ مشہور مقامات میں دورہ کرکے اس رقم کو فراہم کریں امید ہے کہ بزرگان قوم ہماری اور اپنی شرم رکھیں گے اور ایک خالص مذہبی کام کے انجام دینے میں ہم کو مایوس نہ کریں گے،

(الندوہ)

جلسہ دستار بندی ندوۃ العلماء

(۱۵ و ۱۶ محرم ۱۳۲۴ھ)

اس سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا کہ ندوہ کے مقاصد اور اغراض نہایت اہم اور ضروری ہیں، اور اسی بنا پر شروع شروع میں تمام ملک میں ندوہ کی طرف وہ جوشِ التفات ظاہر کیا گیا جو حیرت انگیز تھا، لیکن جو نتائج لوگوں کے خیال میں تھے چونکہ اس کا ظہور نہیں ہوا اسلیئے لوگ افسردہ ہوتے گئے، ارکانِ ندوہ اس حالت سے بے خبر نہ تھے لیکن وہ ہتھیلی پر سرسوں کیونکر جما سکتے تھے اور جو امور سالہا سال میں انجام پانے کے قابل ہیں، وہ دو چار سال میں کیونکر لوگوں کو دکھا سکتے تھے،

ندوہ کے مقاصد میں سے ایک بڑا مقصد ایک وسیع دار العلوم کھولنا اور طلبہ کو جدید ضرورتوں کے موافق تعلیم و تربیت دینا تھا، چنانچہ نمونے کے طور پر ایک دار العلوم کھولا گیا اور اس میں دو نصاب مقرر کئے گئے، ایک فراغِ تحصیل کا اور دوسرا تکمیل کا خدا کا شکر ہے کہ پہلے نصاب کے موافق طلبہ کی ایک جماعت فارغ التحصیل ہو گئی، اور اس تقریب سے ان کی عطائے سند اور تقسیمِ انعام کا جلسہ ۱و ۲ر مارچ ۱۹۰۶ء کو لکھنؤ میں قرار دیا گیا، ان جلسوں کی کارروائی حسبِ ذیل ہو گی،

(۱) مشہور علما رو واعظین تقریر کریں گے اور وعظ فرمائیں گے،

(۲) طلباے فارغ التحصیل مختلف علمی عنوانوں پر تقریر کریں گے جس سے ان کی قابلیت اور لیاقت و خیالات اور قوت تقریر کا اندازہ ہوگا،

(۳) طلبہ سے عربی زبان میں مضامین لکھوائے جائیں گے،

(۴) طلباے فارغ التحصیل کو سند دیجائے گی، اور انعام تقسیم ہوگا،

(۵) تجاویز ترقی و استحکام دار العلوم پیش ہوں گی،

(۶) ناظم ندوہ اور صدر ندوہ اور ارکانِ ندوہ کا جدید انتخاب ہوگا،

تمامی بہی خواہانِ اسلام سے عموماً اور علما و واعظین و مہتمانِ انجمہاے اسلامیہ و مدارسِ اسلامیہ سے خصوصاً امید ہے کہ تاریخ معینہ پر ضرور تشریف لائیں،

مہمانوں کے ٹھہرنے کا انتظام دار العلوم ندوہ واقع گولا گنج میں کیا جائے گا، خورد و نوش اور قیام کا انتظام ندوہ کی طرف سے صرف اُن لوگوں کے لئے کیا جائے گا، جو ندوہ کے ممبر ہوں ممبری کی فیس دو روپیہ ہے،

(الندوہ ۔ جلد ۳ نمبر ۱۲)

ذیحجہ ۱۳۲۴ھ مطابق جنوری ۱۹۰۷ء

ہز ہائنس سر آغا خاں

ندوۃ العلما میں

نہایت خوشی کی بات ہے، کہ اب ندوۃ العلما کی طرف، قوم کے سربرآوردہ اصحاب کی توجہ مبذول ہوتی جاتی ہے مسلم لیگ کے جلسہ میں جب سکریٹری دار العلوم نے جناب ہز ہائنس سر آغا خاں سے ملاقات کی تو جناب ممدوح نے ندوہ کے متعلق کچھ مشورے کئے، اس تقریب میں سکریٹری دار العلوم نے ہز ہائنس سے خواہش ظاہر کی کہ وہ کلکتہ جاتے ہوئے لکھنؤ میں ندوہ کا ملاحظہ فرمائیں، جناب ممدوح نے نہایت خوشی سے قبول فرمایا، چنانچہ ۳۱ رجنوری ۱۹۱۱ء کو ہز ہائنس دہلی سے لکھنؤ میں رونق افروز ہوئے، اور ۳ رفروری ۱۹۱۱ء کو جدید عمارت دار العلوم کے زیر تعمیر ہال میں ایک نہایت شاندار جلسہ ہوا، ہال نہایت خوبی سے سجایا گیا تھا، تقریبًا پانچسو چیدہ اصحاب کا مجمع تھا جن میں آنریبل راجہ علی محمد خاں بہادر آنریبل سر راجہ تصدق رسول خاں بہادر، راجہ نواب علی خاں، مولانا عبد الباری صاحب فرنگی محلی کا نام خاص طور پر قابلِ ذکر ہے،

ہز ہائنس ٹھیک ۱۲ بجے تشریف لائے، طلبہ نے جن کی دورویہ قطار سڑک کے دونوں طرف کھڑی تھی، اہلاً و سہلاً و مرحبا کا زور سے غلغلہ بلند کیا، سکریٹری دار العلوم، اور مولانا سید عبد الحئی صاحب اور دیگر ارکانِ ندوہ نے ہز ہائنس کا استقبال کیا، ہز ہائنس ہال میں تشریف لائے، اور صدارتی کرسی پر جلوس فرمایا، دار العلوم کے ایک طالب العلم نے قرآنِ مجید کی چند آیتیں

تلاوت کیں، اس وقت ہز ہائنس اور تمام شرکاے جلسہ کھڑے ہو گئے، اس کے بعد سکرٹیری دار العلوم ندوہ نے فارسی زبان میں اڈریس پڑھا،

چونکہ ہز ہائنس کا اصلی مقصد طلباے دار العلوم کے خیالات و معلومات کا اندازہ کرنا تھا، اسلئے جناب ممدوح نے طلبہ کو بلا کر ان کو تقریر کا موقع دیا، اور بعض طلبہ کے لئے خود تقریر کا موضوع متعین کر دیا، طلبہ نے نہایت شستہ اور فصیح عربی میں تقریریں کیں، بالآخر ہز ہائنس نے کھڑے ہو کر نہایت فصیح فارسی میں برجستہ تقریر کی جس میں دار العلوم کے مقاصد اور تعلیم کی نہایت تعریف کی اور فرمایا کہ ندوہ کی تعلیم کے سلسلے تمام ہندوستان میں پھیلنے چاہئیں تاکہ تمام مذہبی گروہ میں یہ روشن خیالی پیدا ہو جائے، یہ بھی فرمایا کہ طلبہ کو تعلیم کی تکمیل کے لئے، یورپ کی یونیورسٹیوں میں بھیجنا چاہئے، اور جس طرح یہودی اور عیسائی پیشوایانِ مذہب علومِ جدیدہ کو مذہب کی حمایت کے لئے سیکھتے ہیں، علماے اسلام کو بھی اسی طرح سیکھنا چاہئے تاکہ جدید تعلیم یافتہ گروہ پر اپنا مذہبی اثر ڈال سکیں، اور ان کی رہبری کر سکیں، اخیر میں فرمایا کہ میں ہمیشہ ندوہ کا معین اور مؤید رہوں گا،

ہز ہائنس کے بیٹھ جانے کے بعد مولوی عبد الباری صاحب فرنگی محلی نے ہز ہائنس کی تشریف آوری کا شکریہ ادا کیا اور فرمایا کہ ہم کو ہز ہائنس جیسے لوگ درکار ہیں، جو مسلمانوں کی ٹوٹی ہوئی کڑیوں کو ملا سکیں،

جلسہ کے ختم ہونے کے بعد معززینِ جلسہ نے ہال کے دروازہ تک ہز ہائنس کی مشایعت کی اور ہز ہائنس موٹر پر فرودگاہ کو روانہ ہو گئے، ہم اس موقع پر اڈریس کو درج کرتے ہیں،

پیشگاہِ خدامِ عالی مقام جنابِ مستطاب حضور ہز ہائینس

سر آغا خان بہادر دام عزہ و مجدہ

ما جملہ ارکانِ دار العلوم ندوہ بکمالِ خلوص و نہایت صمیم قلب، التفات و توجہ سامی را سپاس گذاریستیم زحمتی کہ بندگانِ عالی بہ تشریف آوردن دریں درسگاہ برخود روا داشتند ما جملہ ارکانِ دار العلوم و اسلامیانِ ایں شہر بکمال خلوص و نہایت امتنان بہ سپاس گذاری و منت پذیری آں تر زباں ہستیم،

والاجاہا! ما اجازت طلب ہستیم کہ چیزے از اسبابِ تاسیس ایں مدرسہ در پیشگاہِ سامی باختصار تمام عرضہ داریم،

والاجاہا! ایں خود حاجت باظہار ندارد کہ ملت اسلام، باقلیم یا نژاد، یا خانوادہ اختصاصے ندارد بلکہ ہر کس از ہر کشور و ہر نژاد کہ باشد محض ایں کہ کلمۂ اسلام را بر زبان آورد مسلم می شود و در جملہ حقوقِ ملت دین با مسلمانانِ قدیم برابری تواند کرد، بناءً علی ذالک از آغاز اسلام جماعہ مخصوص بایں کار بودہ است، کہ علوم دینیہ و تاریخ ملت و زبانِ عرب را نگہداری بکند و متکفل ایں امور باشد، ہمیں جماعت است کہ بخطاب علما موصوف ست، و در عہدِ اسلام ہمہ آنانکہ دارای فلسفہ و تاریخ و ادب و بلاغت بودہ اند ازیں جماعت بودہ اند، یکے از واجبات و مزایای ایں جماعت آنست کہ مقتضیاتِ احوال را در نظر داشتہ باشد یعنی در ہر عہدے بہر طوری کہ درخور آں وقت و آں عہد باشد، تحفظ اسلام و حالت اسلامیاں تواند کرد، دریں عہد در جملہ امور از تمدن و معاشرت و اخلاق و تعلیم، انقلابے بزرگ پیدا گشتہ است اما در یغیست کہ علمائے عہد ما از مقتضیاتِ روزگار بکلی غافل بودہ اند ازیں ممر گامی در راہ ترقی نزدہ ہماں بر حالتِ پیشینہ قناعت داشتند یکے از عواقب

نتیجهٔ این حالت آن بود که علما را در نظر مردم که تربیت یافته دانشهاے تازه هستند وقعی وجاهی نماند و علما از کار هدایت وارشاد بالکلیه معطل گشتند، و نظر برین اسباب جماعه از علما انجمنی موسوم به ندوة العلماء بر پا کردند که اهم المطالب او دو کار بوده است، یکے اصلاح نصاب وطریقهٔ تعلیم و دیگر رفع مخاصمت ونزاع که درمیانهٔ طوائف مختلفهٔ اسلام حادث گشته است، اما چون عامهٔ علما هیچگونه براصلاح نصاب راضی نبوده اند، ندوة العلماء را تاسیس مدرسه ناگزیر افتاد، که نصاب تعلیمش باندازهٔ مقتضیات این عهد باشد واین همه دار العلوم ست که در عمارت جدید او فراهم گشته ایم، ازجملهٔ اصلاحاتی که در نصاب تعلیم بر روے کار آمد یکے ازان تعلیم فلسفهٔ جدید، و زبان انگریزی ست، زبان انگریزی اگرچه چند سال ست که داخل نصاب بوده است اما چون عامهٔ مردم وخاصهٔ علماے قدیم در مخالفت او شدت داشتند، سالے چند اجراے او معطل ماند، تا آنکه دو سال ست که تعلیم این زبان بر جملهٔ اولادِ مدرسه لازم کردیم، یکے از مختصات این مدرسه تکمیلِ فن ادب و بلاغت ست که دو کس از اہلِ زبان را بکار تدریس این فن مقرر داشته ایم، و چون کار آموزانِ دانش را برای وسعتِ نظر و توسیعِ معلومات از کتب خانهٔ عمومیه گزیر نبود، هم در محوطهٔ دار العلوم کتب خانهٔ بزرگی بنیاد نهادیم که دارای هفت هزار کتب نادره خطیه ومطبوعه است ومی توان گفت که یکے از اعظم کتب خانهاے هند ست، مزیتِ تعلیمِ این مدرسه تا به این درجه رسیده که گویا از مسلمات عامه است، ڈاکٹر هاروز که یکے از فاضل مستشرقین ست و نواب محسن الملک استعدادِ تلامذهٔ این مدرسه را بر محکِ اعتبار زده به نوعے خاص اعتراف نموده اند چنانکه از تحریراتِ ایشان که در کتابِ معاینه درج ست اندازه توان کرد، طلابِ این مدرسه می توانند که ارتجالاً به زبانِ عربی نطق بدهند و این طور در اقلیم هند تا حال معمول و مشاهد نبوده است، از جملهٔ مزایای تربیتِ این مدرسه آنست که اولادِ او از تعصب وعناد که گویا خاصهٔ جماعتِ علما شده است مطلقاً برکران بوده اند ومقالاتِ ایشان که در مجلهٔ الندوه هر ماهی اشاعت می پذیرد برین دعوی

آئینہ روشن و دلیلے واضح ست و چون نتائج تعلیم و تربیت این مدرسہ ہر روز واضح تر می گشت اہل ملت
را ابرو التفاتِ خاص پدید آمد، حضور فرماں روائے ریاست عالیہ حیدرآباد و از آغاز کار باعانت
و ہمت مبذول داشتند، جناب ہر ہائنس بیگم صاحب بھوپال چند ماہ است کہ بہ عطیہ دو نیم صد ماہوار
بر ما منت گذاشتہ اند، جناب بیگم صاحب ریاست بھاولپور پنجاہ ہزار روپیہ برائے تاسیس عمارت
دارالعلوم نوازش فرمودند، و بالاتر از ہمہ آنکہ گورنمنٹ انگریزی بعطائے پنجصد ماہوار صیغہ تعلیم دینی
را قوت و استحکام دادہ است و ما جملہ مسلمانانِ ہند سپاس گزار این منت بے اندازہ ہستیم، در باب
توسیع تعلیم انچہ ما پیش نظر داریم بسیار بالاتر از ان ست کہ تا حال بروی کار آمدہ است، ما می خواہیم
کہ طلاب این درسگاہ پس از تکمیل اینجا بفرنگستان بروند و از مستشرقین آنجا علوم ادبیہ را فرا گیرند، و در
اکتشافات و تحقیقاتِ تازہ علمائے آن دیار را شرکت و دستیاری توانند کرد، ہمچنیں می خواہیم کہ طلاب
این مدرسہ در علوم و فنونِ جدیدہ مہارت کلی داشتہ باشند

والا جاہا! ترقیہ ملت و امت را انچہ از ہمہ مقدم تر است این ست کہ در میانہ ایشاں طائفہ
موجود باشد کہ در محاسنِ اخلاق و علو نفس و پاکیزگی سرشت و نیکی طبع و ایثار نفس، مردم را نمودار و
مثالی باشد تا مردم از ہمہ جنس با و اقتدا آرند و بگیرای نیروے روحانی، عالمے را تواند مسخر کرد، اگر خدا ناکردہ
ہمچنیں گروہے از میان برخیزد بنای اخلاق و عمل یکبارہ از پا می افتد و شیرازہ مزایای انسانی از ہم
می گسلد، دریں حالت ملت و امت پیکرے خواہد بود بے جان و تنے بے سر و گلے بیرنگ و آئینہ بے صفا،

انچہ از دارالعلوم ندوہ نصب العین ما بودہ است، احداث ہمچنیں طائفہ ایست و اگر بتائید الٰہی
کمتر عددی ہم ازین گونہ توانیم کرد، انتہائے آرزو ما خواہد بود،

بار دیگر ما جملہ ارکانِ دارالعلوم ندوہ سپاس تشریف آوری بندگان سامی بجا می آریم و دعا
می کنیم کہ ایزد توانا ذاتِ ستودہ صفات را از جملہ مکارہ آفات محفوظ و مصئون باد"، (الندوہ، جلد ۷، نمبر ۳
مارچ سنہ ۱۹۱۰ء)

دار الاقامہ کے کمروں کی تیاری

دار العلوم کی عمارت بننی شروع ہو گئی، اس کے آس پاس جو تعلیمی عمارتیں گورنمنٹ اور تعلقہ داران اودھ کی طرف سے بن رہی ہیں یعنی صنعتی کالج اور کیننگ کالج کا بورڈنگ ان عمارتوں نے دار العلوم کے منظر کو اور خوبصورت بنا دیا حسن اتفاق سے چونکہ دار العلوم کی زمین بلند اور نمایاں واقع ہوئی ہے، اسی لئے اس کے پہلو کی عمارتیں جلوب کی عمارتیں معلوم ہوتی ہیں ہندوستان میں یہ پہلا موقع ہے کہ جدید علوم اور قدیم علوم کی درسگاہیں پہلو بہ پہلو بن رہی ہیں، اور ندوہ کا مقصد بھی یہی ہے ع

ڈانڈ املا دیا ہے ارم سے تتار کا

لیکن دار العلوم کی عمارت اُس وقت تک معطل پڑی رہیگی جب تک اس کے ساتھ کا بورڈنگ (دار الاقامہ) بھی نہ بن جائے، سید جعفر حسین صاحب نے دار الاقامہ کے کمروں کا خاکہ اور صحیح تخمینہ، موقع زمین دیکھ کر قائم کیا ہے، فی کمرہ سات سو روپیے لاگت آئے گی، اور ہر کمرے میں تین طالب العلم رہ سکیں گے، ان کمروں کی تیاری کے لئے مختلف تجویزیں قرار دی گئی ہیں،

(۱) چونکہ دار العلوم کی عمارت کی لاگت ایک معزز خاتون نے عنایت کی ہے اسلئے دار الاقامہ بھی خاتونوں کی طرف سے تیار کرایا جائے، ایک ایک کمرہ ایک ایک خاتون

کے نام سے بنے اور عمارت کی پیشانی پر اُن کا نام کندہ کرایا جائے، جو بزرگ اپنی مستورات کی یادگار میں ایسے کمرے تعمیر کرانا چاہیں، وہ بھی اس چندے میں شریک ہوسکیں گے، دار الاقامہ کے اس سلسلے کا کوئی موزوں نام آیندہ تجویز کیا جائے گا،

(۲) معزز اشخاص کی طرف سے کمرے تیار کرائے جائیں،

(۳) ہر شہر کے مسلمانوں کے مجموعی چندے سے ایک ایک کمرہ تیار کرایا جائے،

تینوں قسم کے چندہ دینے والوں کے نام اس وقت تک جو ہمارے پاس آگئے ہیں ہم ذیل میں درج کرتے ہیں، لیکن ابھی تک رقمیں وصول نہیں ہوئی ہیں، کیونکہ ابھی تک ان بزرگوں سے رقمیں طلب نہیں کی گئی تھیں، لیکن اب اس فنڈ کا علیحدہ حساب بنگال بنک میں کھول دیا گیا ہے، اس لئے درخواست ہے کہ لوگ اپنا اپنا چندہ ارسال فرمائیں،

جناب ہر ہائنس نواب بیگم صاحبہ ریاست جنجرہ علاقہ بمبئی ایک ہزار روپیہ، یہ رقم وصول ہوچکی،

جناب بیگم صاحبہ نواب علی حسن خاں صاحب بھوپال،

جناب مولوی حبیب الرحمٰن خانصاحب رئیس بھیکن پور علی گڈھ، یہ یادگار اہلیہ مرحومہ خود تین کمرے،

جناب حافظ عبد الحلیم صاحب رئیس کانپور،

جناب مسٹر محمد اسحٰق صاحب وکیل ہائی کورٹ الہ آباد، بیادگار اہلیہ مرحومہ خود،

جناب شیخ جان محمد صاحب رئیس ہوشیارپور پنجاب، پانسو روپیے وصول ہوچکے ہیں،

جناب فضل حق صاحب کاکاخیل جاگیردار سرحد ضلع پشاور، تخمیناً ایکہزار روپئے قیمت کے زیورات بھیجے ہیں،

جناب حاجی شیخ نذیر حسین صاحب تعلقہ دار گدیہ ضلع بارہ بنکی،

مسلمانانِ پشاور بمعرفت جناب مولوی جمیل احمد صاحب چیف کمشنر صوبہ سرحدی چھ سو سے زائد رقم وصول ہوچکی ہے،

جناب مولوی سید احمد صاحب امام جامع مسجد دہلی از جانب مسلمانانِ دہلی،

مسلمانانِ کوہاٹ،

مسلمانانِ مدراس معرفت جناب مولانا عبد السبحان صاحب تاجر اعظم مدراس ایکہزار نو سو سے زائد رقم وصول ہو چکی ہے،

جناب راجہ نوشاد علی خانصاحب لکھنؤ،

جناب فتح محمد صاحب ٹور کیپر جالندھر، پانسو روپیہ وصول ہو چکے ہیں،

جناب مولوی حکیم محمد ولی صاحب کمنڈوی سپرنٹنڈنٹ سنٹرل جیل گلبرکہ دکن، تین سو روپیہ

(الندوہ - ج ۶ نمبر ۵)

ماہ جون سنہ ۱۹۰۹ء مطابق جمادی الاولی سنہ ۱۳۲۷ھ

مصر کی یونیورسٹی

ہمارے ناظرین کو معلوم ہوگا کہ مصر کی قومی یونیورسٹی جسکا نام جامع مصریہ ہے، اس کو قائم ہوئے صرف ایک سال کی مدت ہوئی، اتنے تھوڑے سے زمانہ میں اس نے نہایت ترقی کی، اور اسکی ترقی کی رفتار روز بروز بڑھتی جاتی ہے، یورپ کی سلطنتوں نے اسکی تائید و اعانت پر آمادگی ظاہر کی ہے، چنانچہ اٹلی نے اطلاع دی ہے کہ کیمسٹری کا جو کارخانہ یونیورسٹی میں قائم کیا جائے گا، اسکے تمام آلات اور سامان اٹلی کی سلطنت ہدیۃً ارسال کرے گی، حال میں احمد توفیق راغب نے ساڑھے سات ہزار روپئے یونیورسٹی فنڈ میں عنایت کئے ہیں،

یونیورسٹی کا ایک بڑا مقصد یہ بھی ہے کہ اپنے یہاں کے طلبہ کو خاص خاص علوم و فنون کی تکمیل کے لئے یورپ کی یونیورسٹیوں میں بھیجتے ہیں، اس سے پہلے ایک جماعت جا چکی ہے، اور اب دوسری جماعت عنقریب روانہ ہوگی، قاعدہ یہ ہے کہ جو طلبہ اس غرض کیلئے تیار ہوتے ہیں، انکا مختلف علوم و فنون میں ایک خاص امتحان لیا جاتا ہے، چنانچہ علم ادب کے چند سوالات ہم اس غرض سے المؤید سے نقل کرتے ہیں کہ ہمارے یہاں کے علما اندازہ کر سکیں، کہ اب علم ادب پر کن حیثیتوں سے نگاہ ڈالی جاتی ہے، اور فن ادب کے کمال کے لئے کس قسم کے معلومات ضروری ہیں،

(۱) سبعہ معلقہ کے ہر قصیدہ میں جو شعر سب سے اچھا ہے اسکو لکھو اور اسکی ترجیح کے وجوہ بتاؤ، ہر قصیدہ کا موضوع کیا ہے اور اس سے اہل عرب کے کن اخلاق اور عادات کا ثبوت ہوتا ہے،

(۲) بتاؤ کہ ایران اور رومہ کی انشا پردازی کا اثر عرب کی زبان پر کیا پڑا، یہ اثر کن لوگوں نے پیدا کیا، مثالوں اور سندوں سے اس کا ثبوت دو،

(۳) بصرہ اور کوفہ کی حالت اس حیثیت سے لکھو کہ وہ علوم عربیت کے تربیت گاہ تھے،

(۴) عرب میں فن موسیقی کی تاریخ لکھو، اور بتاؤ کہ عرب کے تمدن اور فن ادب پر اس کا کیا اثر ہوا،

(۵) کیا دولت عباسیہ اور امویہ میں ایسے شعرا بھی پائے جاتے ہیں جو عرب نہ تھے لیکن علم ادب میں امام فن سمجھے جاتے تھے، ان میں سے بعضوں کے نام اور ان کے حالات لکھو،

(الندوہ ج ۶ نمبر ۵)
جمادی الاولی ۱۳۲۷ھ مطابق جون ۱۹۰۹ء

بھوپال میں ندوۃ العلما کا وفد

اور

حضور سرکار عالیہ خلدہا اللہ تعالیٰ کی فیاضی

یہ طے پاچکا تھا کہ اوائلِ سرما میں ندوۃ العلماء کا وفد ڈیپوٹیشن مستقل سرمایہ کے جمع کرنے کے لئے اطرافِ ملک میں روانہ ہوگا، چنانچہ ۱۹ اکتوبر ۱۹۰۵ء کو پہلا وفد لکھنؤ سے روانہ ہوا، اور سب سے پہلے اس نے بھوپال کی اسلامی ریاست کی طرف رُخ کیا، وفد کا جس طرح استقبال ہوا جو کارروائیاں ہوئیں، جن کامیابیوں کی امید ہے، یہ امور ہم آئندہ لکھ سکیں گے، لیکن اس وقت ہم اس کیفیت اور اثر کو ظاہر کرنا چاہتے ہیں جو ہمارے دل پر حضور سرکار عالیہ کی باریابی اور ان کی ہمکلامی کا شرف حاصل ہونے سے ہوا، مجھ کو حکمرانانِ اسلام میں سے، متعدد رؤسا اور والیان ملک کی خدمت میں حاضر ہونے کا اتفاق ہوا ہے، ان سے گفتگو اور ہمکلامی کی بھی نوبت آئی ہے لیکن میں بغیر کسی قسم کی رواداری اور تملق کے اس کہنے پر مجبور ہوں کہ میں نے اس وقت تک کسی رئیس یا والی ملک کو اس قدر وسیع المعلومات، خوش تقریر، فصیح اللسان، نکتہ سنج اور دقیقہ رس نہیں دیکھا، وہ تقریر فرمارہی تھیں، اور میں محو حیرت تھا کہ کیا دہلی اور لکھنؤ کی سرزمین کے سوا، اور کسی ملک کا آدمی بھی ایسی شستہ اور فصیح اردو کے بولنے پر قادر ہوسکتا ہے؟

وہ مختلف علمی اور انتظامی امور پر گفتگو کرتی تھیں، اور میں سوچتا تھا کہ کیا مخدرات اور حجلہ نشین بھی اس قدر معلومات حاصل کر سکتی ہیں؟ وہ لطف و عنایت سے تواضع کے لہجہ میں مجھ سے دریافت فرماتی تھیں کہ "آپ کو یہاں کسی قسم کی تکلیف تو نہیں" اور میں ہمہ تن استعجاب تھا کہ کیا مجھ جیسے ہیچ میرز کو ایک حکمران ذوی الاقتدار اس طرح مخاطب بنا سکتا ہے۔

سب سے پہلے جناب ممدوحہ نے (میزبانانہ اخلاق کے بعد) مجھ سے سوال کیا کہ تم نے یہاں کے مدارس دیکھے"، چونکہ دیوالی کی تعطیل کی وجہ سے مدارس بند تھے، میں نے عرض کیا کہ نہیں، اس پر افسوس ظاہر کیا، اور فرمایا کہ کاش آپ ایسے زمانہ میں آتے کہ مدارس کو دیکھ کر رپورٹ کر سکتے، میں نے وعدہ کیا کہ پھر حاضر ہونگا، اس پر نہایت مسرت ظاہر کی، اور کہا "یہ میرے فائدہ کی بات ہے"۔

عربی علوم و فنون کے تنزل پر نہایت افسوس ظاہر کیا، اور فرمایا کہ "میں نے خود جس پایہ کے علما و فضلا دیکھے تھے آج ایک بھی اس درجہ کا نظر نہیں آتا" میں نے کہا کہ اسباب ہی ایسے پیدا ہو گئے ہیں، انگریزی گورنمنٹ میں عربی دانی کسی قسم کی معاش کا ذریعہ نہیں بن سکتی، اور دنیا کا کوئی کام بغیر انتظام معاش کے انجام نہیں پا سکتا، اسلامی ریاستیں البتہ عربی کو سنبھال سکتی تھیں لیکن وہ بھی تمام نوکریوں اور ملازمتوں میں انگریزی دانی کی شرط لگاتی جاتی ہیں، میری اس تقریر کے جواب میں جو کچھ جناب ممدوحہ نے فرمایا اس نے نہ صرف مجھ کو ساکت کر دیا بلکہ میں ندامت و انفعال سے عرق عرق ہو گیا، فرمایا کہ "آپ لوگ جس طرح عربی کی تعلیم دیتے ہیں، اس سے کوئی شخص اس قابل نہیں ہو سکتا کہ کسی ملکی خدمت کو انجام دے سکے، عربی خواں طلبہ کا یہاں یہ حال ہے کہ پندرہ پندرہ بیس بیس برس سے عربی پڑھ رہے ہیں اور فارغ التحصیل بھی نہیں ہوتے اور صرف اس وجہ سے کہ اگر فراغ کا نام ہو گا تو اُن کا وظیفہ بند ہو جائے گا، چونکہ عربی داں کسی ملکی خدمت کے انجام دینے کے قابل نہیں ہوتے اس لئے مجبوراً ان کو کوئی خدمت نہیں دیجا سکتی، جناب ممدوحہ

کی یہ راے بالکل صحیح ہے، اور اس کا جواب کیا ہو سکتا تھا، البتہ میں نے اس قدر کہا کہ ندوۃ العلما نے اسی غرض سے طرزِ تعلیم اور نصابِ تعلیم میں تبدیلی کی ہے،

اس کے بعد دیر تک اس پر گفتگو کرتی رہیں کہ اہلِ ملک تعلیم کی طرف متوجہ نہیں ہوتے اس وجہ سے تعلیم پر جو کچھ صرف ہو رہا ہے، اس سے خود ملک کو کوئی فائدہ نہیں پہنچتا، میں نے عرض کیا کہ تعلیم جبری کیوں نہ کر دی جائے، جیسا کہ بعض ریاستوں نے اس پر عمل کیا ہے، فرمایا کہ جبری تو نہیں کر سکتی، لیکن یہ کیا کم ہے کہ تمام بڑے بڑے عہدے باہر والوں کو ملتے ہیں، اہلِ ملک میں سے ایک بھی کسی بڑے عہدہ پر مامور نہیں، اگر غیرت ہو تو یہ امر جبر سے کیا کم ہے، اہلِ ملک وظائف اور مناصب کے خوگر ہو گئے ہیں، ان کو نوکری اور ملازمت سے غرض ہی نہیں، وہ ہر وقت صرف وظائف اور مناصب کے متقاضی رہتے ہیں"،

پھر فرمایا کہ "اردو میں علومِ جدیدہ کی کتابیں کیوں نہیں ترجمہ کی جاتیں"، میں نے کہا کہ ترجمہ کون کرے، انگریزی خواں مصطلحاتِ علمی کا اردو میں ترجمہ نہیں کر سکتے، اور عربی خواں، انگریزی نہیں جانتے ہیں، میں نے انجمن اردو کی طرف سے اشتہار دیا، اور کیمسٹری کے مصطلحات چھاپ کر شائع کئے لیکن کہیں سے کوئی صدا نہیں آئی، فرمایا کہ "کیوں نہ ایک محکمہ قائم کیا جائے جس میں عربی و انگریزی دونوں زبانوں کے زبان داں ملازم رکھے جائیں، ریاستِ آصفیہ جو سب سے بڑی مقتدر ریاست ہے آسانی سے اس کام کو انجام دے سکتی ہے"،

غرض اس قسم کے مضامین پر کامل ڈیڑھ گھنٹہ تک گفتگو کی، اور اس فصاحت کے ساتھ کہ میں ہمہ تن محوِ حیرت رہا،

تقریر میں بعض بعض جملے ایسے ہوتے تھے جو انشاپردازی کی شان ظاہر کرتے تھے، مثلاً "جب سے عنانِ حکومت میں نے اپنے ہاتھ میں لی"، "ملک کی تعلیمی حالت پر میرا دل رو رہا ہے"، یہاں کے

لوگ لیاقت حاصل نہیں کرتے بلکہ استحقاقِ آبائی پیش کرتے ہیں"

لیکن یہ جملے ان کی زبان سے اس سلاست اور صفائی کے ساتھ ادا ہوتے تھے کہ مطلقاً تصنع اور آورد نہیں معلوم ہوتی تھی،

جناب ممدوحہ کی مصروفیتِ ملکی کا یہ حال ہے کہ روزانہ بلاناغہ ۱۱ بجے سے ۴ بجے تک متصل دفتر میں پس پردہ بیٹھ کر، تمام کاغذات کو سنتی اور ان پر احکام مناسب لکھواتی ہیں، جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ پردہ میں بیٹھکر عورتیں قابل نہیں ہو سکتیں، اُن کے جواب کے لئے صرف جناب ممدوحہ کا نمونہ کافی ہے،

(الندوہ جلد ۲ نمبر ۸)

شعبان ۱۳۲۳ھ مطابق اکتوبر ۱۹۰۵ء

ندوۃ العلما کا نیا دور

اور

اس کا جلسۂ سالانہ

(بنارس میں)

ندوۃ العلما پر اس تھوڑی سی مدت میں تین دور گذرے ہیں، ایک اس کا آغاز جو اس زور شور کا تھا جس کے غلغلہ سے دفعۃً تمام ہندوستان گونج اٹھا، دوسرا انحلال انجمن (عہد ظلمت) یہ دور اس وقت سے شروع ہوتا ہے جب مولوی محمد علی صاحب (سکریٹری ندوۃ العلما) اپنے ضعف و ناتوانی کی وجہ سے ندوہ کے خدمات سے علحدہ ہونے لگے اور یہاں تک نوبت پہونچی کہ باوجود عام اصرار کے، اپنے عہدہ سے مستعفی ہو گئے،

تیسرا دور ۱۹۰۵ء سے شروع ہوتا ہے، جب کہ ارکان کو یہ حالت دیکھ کر سخت بےچینی پیدا ہوئی، معتمد دار العلوم نے ترک تعلقات کر کے خود ندوہ میں سکونت اختیار کی، فرقہ بندی کا پہلو بیچ سے اٹھ گیا، مصارف جو آمدنی سے بہت زیادہ تھے، گھٹا کر مداخل کے قریب قریب کر لئے گئے، نصاب مجوزہ جس پر اب تک عمل نہیں کیا گیا تھا، جاری کر دیا گیا، انگریزی زبان بطور سکنڈ لنگویج کے لازمی کر دی گئی، مقامی ارکان میں مولوی محمد نسیم صاحب وکیل اور مولوی ظہور احمد

صاحب وکیل کا اضافہ ہوا، شملہ اور امرت سر کو ڈیپوٹیشن گیا، اور کامیاب آیا، اور سب سے بڑھ کر یہ کہ جناب معلی القاب سرکار عالیہ ریاست بھوپال نے سرپرستی فرما کر چھ سو روپیہ سالانہ کی مستقل رقم مقرر کر دی،

ان حالات سے وہ عام افسردگی جو تمام ملک میں پیدا ہو گئی تھی، کسی قدر کم ہونی شروع ہوئی، آس پاس کے مقامات کو ندوہ کی دوبارہ زندگی کا کچھ احساس ہونے لگا، اور اس کی طرف امید کی نگاہیں اٹھنے لگیں، یہاں تک کہ گورکھپور اور بنارس میں جلسہ سالانہ کی تحریک شروع ہوئی، اور بالآخر قرعۂ فال بنارس کے نام پر نکلا، جو ایک مشہور تاریخی مقام ہے، بنارس کی مقامی کمیٹی کے صدر انجمن مولوی محمد عمر صاحب وکیل اور سکریٹری مولوی مقبول عالم صاحب قرار پائے ہیں، اول الذکر صاحب ندوہ کے ارکانِ انتظامی میں ہیں، اور مولوی مقبول عالم صاحب ایک نہایت نیک طینت، اور دیندار آدمی ہیں، اور جس سرگرمی اور ذوق سے وہ جلسہ کی تیاریاں کر رہے ہیں، اس سے بڑی بڑی امیدیں پائی جاتی ہیں،

اس جلسہ میں جو خاص بات اور تمام جلسوں سے مزید ہوگی وہ یہ ہے کہ ندوہ کی تعلیم و تربیت کا نمونہ پیش کیا جائیگا، ندوہ کی تعلیم کے جو انتہائی مقاصد ہیں ان کے ظہور کا تو وقت ابھی نہیں آیا، اس کے لئے کم از کم ابھی آٹھ سال درکار ہیں لیکن اس جلسہ میں اس بات کا تجربہ ہو سکے گا کہ ندوہ کی تعلیم کو اور تمام مدارس پر کیا ترجیح ہے، ندوہ کے طلبہ عام مجالس میں علمی اور اخلاقی مضامین پر عمدگی سے تقریر کر سکتے ہیں، فلسفہ جدید سے ان کو کسی حد تک واقفیت حاصل ہے، علوم قدیمہ و جدیدہ کا وہ کچھ نہ کچھ موازنہ کر سکتے ہیں، ان میں عموماً وسعتِ نظر اور روشن خیالی پائی جاتی ہے، عربی زبان میں وہ مستعدانہ

طور پر مضمون نگاری کر سکتے ہیں،

ہم کو تمام بہی خواہانِ قوم سے اور خصوصاً اُن لوگوں سے جن کے دل میں ذرا بھی مذہب کا درد ہے، امید ہے کہ ضرور اس جلسہ میں شریک ہوں گے، کیونکہ تمام ہندوستان میں یہی ایک مذہبی تعلیم گاہ ہے، جو اپنے اصول کے لحاظ سے بالکل ایک جدید چیز ہے، اور اگر اس کو وسعت اور ترقی دیجائے، تو وہ مسلمانوں کے ہر درد کی دوا ہو سکتا ہے،

(الندوہ ج ۳ نمبر ۱)

محرم ۱۳۲۴ھ مطابق مارچ ۱۹۰۶ء

البشیر اور ندوۃ العلما

جناب مولوی بشیر الدین صاحب کو ندوہ کے حال پر جو قدیم نوازش ہے، وقتاً فوقتاً اس کا ظہور ہوتا رہتا ہے لیکن چونکہ ندوۃ العلمار کا سالانہ جلسہ قریب ہے، اور مولوی صاحب موصوف کو خطرہ پیدا ہوا کہ کہیں جلسہ کی بدولت ندوہ میں کچھ جان نہ آجائے، اس لئے دفعتہً اُن کی مہربانیاں زیادہ ترقی کر گئی ہیں، ایک پرچہ میں ارشاد ہوتا ہے کہ "ندوہ اور دیوبند کا ایک مقصد ہے، باوجود اس کے دونوں نے اپنے جلسوں کی ایک ہی تاریخیں رکھی ہیں، دونوں آپس میں لڑتے ہیں، اور جب یہ خود باہم لڑتے ہیں، تو ہماری اصلاح کیا کر سکتے ہیں؟"

اولاً تو ندوہ اور دیوبند کے مقاصد جداگانہ ہیں اور اس کا بار بار اظہار کیا گیا ہے، ندوہ نے انگریزی تعلیم کو لازمی قرار دیا ہے، حالانکہ علمائے دیوبند کسی طرح اپنے مدرسہ میں انگریزی تعلیم پر راضی نہیں ہوتے، مقاصد متحد بھی ہوتے، تب بھی ایک زمانہ میں دو درسگاہوں کا جلسہ ہونا نفاق کی کوئی دلیل نہیں، مولوی صاحب موصوف فرماتے ہیں کہ "دونوں آپس میں لڑتے ہیں، تو ہماری اصلاح کیا کر سکتے ہیں"، لیکن ہم ان کو یقین دلاتے ہیں کہ اگر دونوں مل بھی جائیں تب بھی ان کی اصلاح نہیں کر سکتے،

انگریزی ترجمۂ قرآن کے ذکر میں مولوی صاحب موصوف نے "ندوہ" کے متعلق زیادہ نوازش سے کام لیا ہے، چنانچہ فرماتے ہیں :-

"اسی وجہ سے مجدد اعظم سرسید رحمۃ اللہ علیہ کی یہ رائے ہے کہ انگریزی علوم وفنون کی تعلیم کو مسلمانوں کی تمام دینی و دنیاوی ترقی کا وسیلہ سمجھتے تھے لیکن افسوس ہے کہ سرسید کی رائے کی مخالفت کی گئی، اور ڈیڑھ اینٹ کی بہت مسجدیں الگ بنائی گئیں، کیا یہ امید ہو سکتی ہے کہ ندوہ میں جو شُدبُد انگریزی تعلیم کا انتظام کیا گیا ہے، اس سے اسلامی علوم کا اعلیٰ درجہ کی انگریزی میں ترجمہ کرنے کا مقصد پورا ہو سکتا ہے؟"

سب سے مقدم سوال یہ ہے کہ علی گڈھ کالج کی خیرخواہی، قوم کی رہبری، مسلمانوں کی صلاح حالت، ان تمام باتوں کا استحقاق کیا مولوی بشیر الدین صاحب کو مجدد اعظم اور ان کے جانشینوں سے زیادہ حاصل ہے؟ ندوہ جب قائم ہوا تو سرسید مرحوم نے اس کی تائید میں متعدد آرٹکل لکھے علی گڈھ میں ایک کانفرنس کے اجلاس میں جس میں خود سرسید مرحوم شریک تھے، نواب محسن الملک نے ایک خاص ریزولیوشن ندوہ کے مقاصد کی تائید میں پیش کیا اور نہایت مفصل تقریر کی، سید محمود نے اس ریزولیوشن کی پرزور طریقہ سے تائید کی، جسمیں یہ بیان کیا کہ "ہمارے دو کام ہیں" دین و دنیا"، ہم نے دنیا کی ترقی کا کام اپنے ذمہ لیا ہے، ندوہ دین کا کام انجام دے رہا ہے، اس لئے ہم کو اس کے مقصد سے پورا اتفاق ہے"، یہ دونوں تقریریں مفصل ہیں، اور کانفرنس کی طرف سے شائع ہو چکی ہیں، سرسید مرحوم کے بعد بھی یہ پالیسی برابر قائم رہی، ڈھاکہ کانفرنس میں ندوہ کی تائید کا ریزولیوشن دوبارہ پیش ہوا، اور نواب وقار الملک نے نہایت زور کے ساتھ اس کی تائید کی،

کیا یہ واقعات غلط ہیں؟ کیا کانفرنس کی رودادوں میں یہ تحریریں موجود نہیں ہیں، اگر ہیں تو کیا مولوی بشیر الدین صاحب ہم سے اس بات کے خواہاں ہیں کہ ہم سرسید، سید محمود، نواب محسن الملک، نواب وقار الملک سے بغاوت کر کے مولوی بشیر الدین صاحب کے علم کے نیچے آجائیں؟

لیکن اس سے زیادہ ہمارے لئے یہ مشکل ہے کہ ندوہ کی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد جب تعمیر ہو رہی تھی تو خود ہمارے مولوی بشیر الدین صاحب نہایت سرگرمی اور نیازمندی سے اینٹ اور گارا دے رہے تھے، مولوی صاحب موصوف کو غالبًا وہ موقع یاد ہوگا، جب کہ کانپور میں ندوہ کے رات کے اجلاس میں مولوی صاحب موصوف شریک تھے اور اون کی دوستی کے جرم میں مولوی ہدایت رسول کی زبان سے مجھکو گالیاں سننی پڑی تھیں، پہلے اجلاس کے بعد بھی مولوی صاحب موصوف ایک زمانہ تک ندوہ کے طرفدار اور مداح رہے ندوہ اگر اپنی اصلی حالت پر نہیں رہا، اور اس وجہ سے مولوی صاحب موصوف نے اس سے کنارہ کیا تو یہ جداگانہ بات ہے لیکن ڈیڑھ اینٹ کی بنیاد رکھنے کے جرم میں تو وہ ہم گنہگاروں میں برابر کے شریک ہیں،

علی گڈھ یا سرسید کی ہوا خواہی کا یہ کوئی معقول طریقہ نہیں ہو کہ کسی گروہ پر اعتراض کرنے کے وقت ان کو بیچ میں لایا جائے، اور اس گروہ کو خواہ مخواہ اس بات پر مجبور کیا جائے کہ وہ سرسید کے متعلق کوئی بات زبان سے نکالے ہمکو معلوم ہے کہ یہ طریقہ اس لئے برتا جاتا ہے کہ ندوہ کی مخالفت کا جوش بڑھا دیا جائے کیونکہ جب یہ کہا جاتا ہو کہ علی گڈھ کالج کے ہوتے ندوہ یا دیوبند کی مطلق ضرورت نہیں ہی، بلکہ ندوہ اور دیوبند قوم کیلئے ضرر رساں ہیں، تو خواہ مخواہ ہوا خواہان ندوہ و دیوبند کو یہ کہنا پڑتا ہے کہ علی گڈھ کالج ہماری مذہبی ضرورتوں کو رفع نہیں کرسکتا، اس سے علی گڈھ کی عالمگیری میں فرق آتا ہی، اور طرفداران علی گڈھ نہایت آسانی سے ندوہ اور دیوبند کے دشمن ہوجاتے ہیں،

ندوہ پر جو کچھ اعتراض کرنا ہو بالذات اور مستقل طور سے کرنا چاہئے، علی گڈھ اور سرسید کو بیچ میں لانا کوئی دیانت دارانہ طریقہ نہیں ہی،

اب ہم مولوی صاحب موصوف کی اصل منطق کی طرف متوجہ ہوتے ہیں، مولوی صاحب موصوف فرماتے ہیں :-

"مجدد اعظم (سرسید) کی یہ رائے ہے کہ وہ انگریزی علوم و فنون کی تعلیم کو مسلمانوں کی تمام دینی اور دنیاوی ترقی کا وسیلہ سمجھتے تھے"

کیا اس کا یہ مطلب ہے کہ صرف انگریزی علوم و فنون میں کمال حاصل کرنا، اور عربی زبان اور مذہبی علوم سے بے بہرہ ہونا تمام دینی و دنیوی ترقی کا وسیلہ ہے، اگر یہ مطلب ہے تو یہ محض تہمت ہے کہ سرسید مرحوم کا یہ خیال اور یہ رائے تھی، سرسید کے زبان دان اب بھی موجود ہیں اور مجھ کو ہرگز توقع نہیں کہ نواب وقار الملک اور ارکان کالج اس رائے کو سرسید کی طرف منسوب کرنے پر راضی ہوں گے،

لیکن اگر اس فقرہ کا یہ مطلب ہے کہ انگریزی تعلیم کے ساتھ عربی اور مذہبی تعلیم میں کامل ہونا، تمام دنیوی اور دینی ترقی کا وسیلہ ہے تو بالکل اور سرتاپا سچ ہے لیکن سوال یہ ہے کہ کیا کالج کا یہ دعویٰ ہے کہ اس نے مذہبی علوم کی تکمیل کا سامان مہیا کیا ہے، کالج تقریباً چھتیس ۳۶ برس سے قائم ہے، اس کا مذہبی نصاب چھپا ہوا موجود ہے، آگے چل کر جو کچھ ہوگا اس سے بحث نہیں، لیکن اس وقت تک تو جو کچھ اس میں مذہبی تعلیم ہے اسی شد بد کے برابر ہے جس قدر "ندوہ" میں انگریزی تعلیم ہے،

جس طرح مولوی ذکاء اللہ صاحب مرحوم سے ایک انگریز نے پوچھا کہ آپ کو انگریزی زبان آتی ہے؟ مولوی صاحب مرحوم نے فرمایا ہاں، اس قدر جس قدر آپ کو اردو آتی ہے، سرسید مرحوم نے کبھی یہ دعویٰ نہیں کیا، کہ وہ کالج میں، فقہ، حدیث، تفسیر، اصول کی کامل تعلیم دیتے ہیں، ۳۶ برس کی وسیع مدت میں کالج نے کوئی مذہبی عالم نہیں پیدا کیا،

اور یہ کالج کی کوئی تحقیر نہیں، کالج تقسیم عمل کے اصول پر کام کر رہا ہو، جیسا کہ سید محمود مرحوم نے اپنی تقریر میں کہا تھا، اور یہ کام کرنے کا سب سے بہترین طریقہ ہے،

فرض کرو، اگر یہ سوال کیا جائے کہ کالج مردہ شو، کفن دوز، غسّال، گورکن پیدا کرتا ہے یا نہیں؟ تو کالج کی درودیوار بول اُٹھے گی کہ نہیں، لیکن اگر یہ سوال کیا جائے کہ مسلمانوں کے لئے جنازہ خوانوں اور موذنوں کی ضرورت ہے یا نہیں؟ تو مولوی بشیر الدین صاحب کے سوا اور کسی کو اختلاف نہ ہوگا،

اب اگر یہ فرض کر لیا جائے کہ ندوہ اور دیوبند موذن اور جنازہ خواں پیدا کرتے ہیں تو کیا علی گڈھ کالج اس حق کو اُن سے چھین لینا پسند کریگا؟ یا یہ کہے گا کہ نہیں یہ بالکل غیر ضروری کام ہیں، اگر یہ دونوں باتیں نہیں ہیں، تو ندوہ اور دیوبند سے اس قدر کیوں عناد ہو؟ یہ بیچارے غریب اپنے جھونپڑوں میں بسر کرتے ہیں، تخت و تاج والوں کو غریبوں کے ستانے سے کیا فائدہ؟

ابھی تک مسلمانوں کا احساس باقی ہو، وہ ابھی ندوہ اور دیوبند کو ضروری سمجھتے ہیں مولوی بشیر الدّین صاحب کو ذرا انتظار کرنا چاہئے، جب مذہبی احساس بالکل فنا ہو جائیگا جب انگریزی تعلیم مذہبی تعلیم کو بالکل دبالے گی، جب ہر ہاتھ میں قرآن کے بجائے ڈارون اور ہیکسلے کی تصنیفات ہوں گی، جب ایسے لوگ کثرت سے پیدا ہو جائیں گے، جو یہ کہتے ہونگے (اور ایسے لوگ موجود ہیں) کہ اگر کعبہ اور مدینہ پر کسی یورپین سلطنت کا قبضہ ہو جائے تو زیادہ بہتر ہو تو مولوی صاحب موصوف کی آرزو پوری ہو جائے گی، اور ندوہ و دیوبند وغیرہ سے کانٹے اسلامی چمن زار سے خود نکل جائیں گے،

"ندوہ" جو کام کر رہا ہے جس قسم کے قابل طلبہ پیدا کر رہا ہے، جس درجہ کے

ماہر عربیت طالب علم اس نے پیدا کردیئے ہیں، البشیر کی نگاہیں اس کے اندازہ کرنے کے قابل نہیں، کم از کم اس کے لئے ڈاکٹر ہارویز (جرمنی) پروفیسر علی گڈھ کالج کا علم اور انصاف پسندی درکار ہے جنھوں نے ابھی حال میں ندوہ کے پرچۂ تکمیل کا اوّل (تقریری) امتحان لیا ہے، اور جس کے متعلق انھوں نے طالب العلم کی لیاقت پر ایک گونہ تعجب ظاہر کیا ہی، اور ہم کو ایک خاص خط لکھا ہی،

ہم نے اکثر البشیر کے حملوں کے جواب میں خاموشی اختیار کی تھی، کیونکہ ہمکو معلوم ہے، کہ کیا ذاتی کاوشیں ہیں جن کی وجہ سے البشیر کا طرز عمل ہمارے ساتھ حیدرآباد کے زمانہ قیام کے بعد بدل گیا ہی، لیکن پبلک اس قدر ضعیف الاعتقاد ہے کہ اسکو ہر بات پر یقین آجاتا ہے اس لئے البشیر جس قدر غلط فہمیاں پھیلانا چاہتا ہے پھیلا سکتا ہے،

اس بنا پر نہایت سخت مجبوری سے ہم کو کبھی کبھی البشیر کے مقابلہ میں لکھنا پڑتا ہی، اور خدا کی ایک قسم ہے کہ میرے لئے اس سے زیادہ کوئی چیز ناگوار نہیں،

البشیر میری قدر دانی کرتا ہے، اور کہتا ہے کہ ایسا شخص جو صدیوں میں پیدا ہوسکتا ہی "ندوہ" میں رہنے سے بیکار ہوگیا، لیکن میں اپنی قدر آپ خود سمجھ سکتا ہوں، میں کیا چیز ہوں؟ میری حقیقت کیا ہے؟ میں اگر اپنے آپ کو ارباب کمال کی صف نعال میں بیٹھنے کے قابل سمجھوں تو مجھ سے زیادہ کوئی نالائق نہیں لیکن بہر حال جو کچھ ہوں "ندوہ" ہی کے جھونپڑے کے لئے موزوں ہوں، ؎

تو و طوبےٰ و ما و قامتِ دوست
فکرِ ہر کس بقدرِ ہمتِ اوست

(۱۹ر فروری ۱۹۱۲ء)

مولوی عبدالکریم صاحب کی معطلی

اور

مولانا عبدالحئی صاحب

جناب مولوی عبدالحئی صاحب! آپ نے مسلم گزٹ میں اس امر سے براءت ظاہر کی ہے کہ آپ مولوی عبدالکریم صاحب کی معطلی میں شریکِ مشورہ نہ تھے،

مولانا! جو روداد جلسۂ انتظامیہ مورخہ ۹ ر مارچ ۱۹۱۳ء شائع ہوئی ہے، اس میں ریزولیوشن کی یہ عبارت ہے:۔

"اس جلسہ کے نزدیک مولوی عبدالکریم صاحب کا مضمون مسئلۂ جہاد جو الندوہ بابتہ جون ۱۹۱۲ء میں شائع ہوا، اس کارروائی کا سزاوار نہ تھا، جو معتمد صاحب دارالعلوم نے بہ مشورۂ مولوی عبدالحئی صاحب و مولوی ظہور احمد صاحب کی، اور یہ جلسہ یہ امر ضروری سمجھتا ہی، کہ مولوی عبدالکریم صاحب سے یہ تینوں حضرات تحریری معافی مانگیں جو نقصانات ان کو ان کی شہرت وغیرہ کے متعلق اس کارروائی سے پہنچے ہیں تلافی کریں"

اس تجویز کی تائید مولوی اعجاز علی صاحب نے کی، مولوی محمد نسیم صاحب نے ترمیم کی کہ اس تجویز کا آخری حصہ جو معافی و تلافی کے متعلق ہے، اس کو نکال ڈالا جائے، اسکی تائید مولوی

عبد الباری صاحب نے کی، اور باتفاقِ آرا ترمیم پاس ہوئی،

یہ ریزولیوشن بہ ترمیم تحریک مقامی پاس ہوا، آپ بھی اس جلسہ میں موجود تھے،
کیا جلسۂ انتظامیہ کی یہ کارروائی، جسمیں نہایت کثرت سے ممبر شریک تھے، اور جو خود آپکے زیر اہتمام شائع کی گئی ہے، غلط سمجھی جائے؟ اور کیا اس میں اتفاقِ آرا کا لفظ غلط ہے؟ اور مولوی عبد الباری صاحب نے اپنی شہادت میں یہ الفاظ بیان کئے ہیں،:-

"اس پر مولوی شبلی صاحب نے فرمایا کہ اچھا آپ (مولوی عبد الحئی صاحب) معطلی کا حکم لکھدیں، مولوی عبد الحئی صاحب نے منظور کیا"

کیا یہ الفاظ غلط ہیں؟

(۷ رجون ۱۹۱۳ء از وکیل)

مولانا عبدالباری کی شہادت[۱]

الندوہ کے مضمون کے متعلق میرے خلاف جو طوفان برپا کیا گیا، اس کے متعلق میں اب تک اس وجہ سے کوئی مفصل تحریر شائع نہ کر سکا کہ سخت بیمار تھا، اس کے علاوہ ایک بڑی وجہ یہ تھی کہ جس قدر تحریریں مخالفت میں نکلی تھیں، کسی ذمہ دار اور شریکِ واقعہ شخص کی نہ تھیں، اس لئے میں ان لوگوں کے مقابلہ میں کچھ لکھنا بے سود سمجھتا تھا لیکن اب مولوی عبدالباری نے مسلم گزٹ میں اپنا مفصل بیان درج کرایا ہے، مولوی صاحب موصوف کا بیان متعدد وجوہ سے قابلِ لحاظ ہے،

(۱) وہ میرے مخالف گروہ کے ایک بہت بڑے ممبر ہیں، اور اس واقعہ کو بدنما صورت میں پھیلانے میں ان کی کوششوں کو خاص دخل ہے، اسی کے ساتھ مولوی عبدالکریم صاحب کی معطلی وغیرہ کے متعلق جو غیر معمولی اجلاس ندوہ کا ہوا تھا، اس کے پانچ ممبروں میں سے ایک مولانا بھی تھے، اور جو کارروائیاں اس وقت تک عمل میں آئیں ان میں شریک تھے لیکن انکی نسبت لوگوں نے یہ تاویل کی کہ ان کو دھمکی یا فریب دیکر اپنا ہمزبان بنا لیا تھا، ان اسباب سے

[۱] یہ بات ہر حال میں لحاظ کے قابل ہے کہ ۹ مارچ ۱۹۱۳ء کو ندوہ کا جو جلسۂ انتظامیہ اس معاملہ کے متعلق منعقد ہوا، اس میں مولانا شریک تھے، اور اس جلسہ کی کارروائی چھپ کر شائع ہو چکی ہے، اس میں مولانا کی کوئی کارروائی درج نہیں حالانکہ وہ روداد میری طرف سے نہیں شائع ہوئی تھی، بلکہ مولوی خلیل الرحمٰن کے دفتر سے شائع ہوئی، جو مولوی عبدالکریم صاحب کے سب سے بڑے حامی اور ان کے مربی ہیں،

ان کی شہادت کے متعلق میں ایک مفصل تحریر شائع کرسکوں گا،

اس معاملہ میں جو فرد قرارداد جرائم میرے اوپر قائم ہی، اس میں سب سے بڑا جرم یہ ہے کہ میں نے دیگر ارکان (شریک فیصلہ مقدمہ) کو دھمکی دیکر اپنا ہمزبان بنا لیا، اور تمام امور اپنی مرضی کے مطابق فیصل کرائے، چنانچہ لکھنؤ سے ایک لوکل اخبار میں ایک اڈیٹوریل نوٹ اس سرخی سے نکلا تھا "مولانا شبلی کی دھمکی"

اصول شہادت کے متعلق اس واقعہ کی تحقیق کا اصل ذریعہ یہ تھا کہ خود ان لوگوں سے دریافت کیا جاتا جن کی نسبت بیان کیا جاتا ہو کہ میں نے ان کو دھمکی دی، یا ان کو مجبور کیا، لیکن پبلک کو اس دردسر کی کیا ضرورت تھی، یہ غنیمت ہے کہ یہ تکلیف مولانا نے خود گوارا کی،

مولانا کی تحریر سے ظاہر ہوتا ہے، اور یوں بھی ہم ارادت مند قیاس کرسکتے تھے کہ مولانا کی ذات گرامی مختلف شئون و حیثیات رکھتی ہی، ایک وہ عالم ہے کہ" بالملکوتیان نہ پرداختے" اس شان کو مولانا ان الفاظ میں ظاہر فرماتے ہیں ا۔

"اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم لوگوں نے تمام تعلقات حکومت سے قطع کردیئے ہیں، مگر آپ لوگوں کا طرز عمل ایسا نہیں ہی، آپ اُن کی خوشنودی کے محتاج ہیں، بلا رو رعایت جو امر حق ہو اسکو ظاہر کروں، چاہے وہ گورنمنٹ کے موافق ہو یا مخالف"۔

دوسرا وہ عالم ہے جس میں مولانا اس درجہ سے تنزل کرکے عالم ناسوت میں تشریف لاتے ہیں، اس شان کو مولانا نے ان الفاظ میں ظاہر فرمایا ہی ؛۔

"اس واسطے اگر یہ معاملہ فرنگی محل کا ہوتا تو میں کوئی پروانہ کرتا، مگر" ندوہ" کا معاملہ ہونے کی وجہ سے مجھے بہت سوچ کر رائے قائم کرنا ہی"!

لیکن بہرحال یہ دونوں شئون بذات خود قائم ہیں، اس کو کسی کی دھمکی اور ڈراؤے سے کوئی

واسطہ نہیں، مولانا نے اگرچہ اپنی شہادت میں حسنِ تاویل اور شانِ نزول کی تفصیل سے بہت کام لیا ہے وذالک شان العلم اذا توسع وتفنن، تاہم اصل معاملہ پر اس سے بہت کچھ روشنی پڑتی ہے، اصل بحث یہ ہے کہ جو تجویزیں منظور ہوئیں، وہ مولانا نے بھی منظور فرمائی تھیں؟ یا نہیں؟ اس امر سے بحث نہیں کہ منظور کرنے کا شانِ نزول کیا تھا، ؟ اور مولانا نے اسکے متعلق کیا کیا گفتگو فرمائی تھی ؟ کیونکہ یہ تو بہرحال مسلّم ہے کہ مولانا جس شان سے "ندوہ" کے ممبر ہیں، اور "ندوہ" کے جلسوں میں تشریف لاتے ہیں، وہ "با ملکوتیاں نیز داختے" والی شان نہیں ہے اس میں مصالحِ وقت، ضروریاتِ زمانہ، مکروہاتِ گردوپیش سب کا خیال رکھنا پڑتا ہے، اور اسی عالم میں ہم لوگوں کو جناب کی ہم بزمی کا شرف حاصل ہے، اور یوں تو فرشتگانِ بابل بھی پہلے نحن فتنۃ فلا تکفر "کا عذر کرتے ہیں لیکن درخواست کنندہ کے اصرار و خواہش پر بہرحال جادو سکھا ہی دیتے ہیں،

معاملۂ زیر بحث میں سب سے زیادہ جناب کی ناراضی اس بات پر ہے کہ گورنمنٹ کو اس معاملہ کی خبر کیوں کی گئی؟ اور اوس کو مداخلت کا موقع کیوں دیا گیا ؟ اور حقیقت میں یہی چیز ہے، جو دیگر اور تمام کارروائیوں کا سنگِ بنیاد ہے، گورنمنٹ کے خبر کر دینے کے بعد بقیہ تمام کارروائیاں خود بخود ضروری تھیں، چنانچہ خود ان ممبروں کے ہاتھ سے انجام پائیں، جو میری مخالف پارٹی کے قائد العسکر ہیں، اس کے متعلق مولانا ارشاد فرماتے ہیں :-

"اس کے بعد مولوی شبلی صاحب نے الندوہ کے مضمون جہاد کا ذکر چھیڑا اور فرمایا کہ اس بات میں کیا رائے ہے، ؟ اس کی اطلاع حکام کو کی جائے یا نہ کیجائے ؟ اس کے جواب میں میں نے کہا کہ حکام کو چاہیں آپ اطلاع کریں یا نہ کریں ایسے امور کی اطلاع ہو ہی جاتی ہے۔"

پہلے یہ گذارش ہے کہ واقعہ کی یہ صورت نہیں، اور چونکہ مولانا کے عالمِ قدس کا بیان نہیں ہے

اس لئے سہو ونسیان کا ہو جانا ممکن ہے، واقعہ کی یہ صورت ہے کہ جب جلسہ کی کارروائی شروع ہوئی تو سب سے پہلے میں نے تمام ارکان موجودہ کو مخاطب کرکے کہا کہ اس معاملہ میں کارروائی کرنے کے دو طریقے ہیں، اور غور کرلیجئے کہ آپ لوگوں کو دونوں میں سے کون طریقہ اختیار کرنا چاہیئے،

ایک طریقہ یہ ہے کہ آپ مولوی عبدالکریم صاحب کی نسبت جو کچھ کرنا چاہیں، بطور خود کرلیں اور اس کی کارروائی دفتر میں موجود رہے تاکہ اگر کبھی گورنمنٹ استفسار کرے، تو جواب دینے کا موقع حاصل رہے،

دوسرا طریقہ یہ ہے کہ آپ گورنمنٹ کو خبر کریں لیکن اس میں یہ احتمال ہے کہ مضمون جہاد کا وہاں ترجمہ کرایا جائے، اور ممکن ہے کہ کوئی مترجم غلط ترجمہ کرے، اس صورت میں مضمون ممکن ہے کہ خطرناک ہو جائے،

میری اس تقریر پر مولانا نے فرمایا کہ "آپ سمجھتے ہیں کہ اس مضمون کا ترجمہ اب تک نہ ہو چکا ہوگا، یا نہ ہو رہا ہوگا" مولانا کے ساتھ اور تمام ارکان نے بھی تائید کی صدائیں بلند کیں، اور آخر طے ہوا کہ ڈپٹی کمشنر صاحب کو اسکی اطلاع دیجائے،

لیکن اگر تسلیم بھی کرلیا جائے کہ تقریر کی وہی صورت تھی، جو مولانا نے بیان کی تاہم اس سے اس قدر ثابت ہوتا ہے کہ گورنمنٹ تک اس معاملہ کو پہونچانا مولانا کے نزدیک چنداں جرم نہ تھا، اور بہرحال وہ تجویز درج کارروائی کی گئی، تو مولانا نے اس سے اپنی برأت نہیں فرمائی،

تجاویز منظور شدہ میں دوسرا امر یہ تھا کہ مضمون مذکور ندوہ کے مقاصد و اغراض کے خلاف ہے،

جو لوگ مذہبی حیثیت کی وجہ سے اس معاملہ میں سخت ناراضی کا اظہار کر رہے ہیں،

اُن کی برہمی کی وجہ یہی ہے کہ اُن کے نزدیک مضمون مذکور ایک مسئلہ مذہبی ہے، اس کو مقاصد اور اغراضِ ندوہ کے خلاف کہنا کس قدر افسوسناک ہے!

جناب مولانا کی شہادت اس مسئلہ کے متعلق یہ ہے:۔

"میں خود اس کے متعلق دوسری رائے رکھتا ہوں، مگر موجودہ زمانہ کے اعتبار سے اس مضمون جہاد ہونے کے باعث ایسے مضامین کی اشاعت ندوہ کے مقاصد و اغراض کے خلاف ہے اور اس لئے بھی ضرور خلاف ہے کہ اس کے لئے گورنمنٹ سے پانچسو روپے بہت غنیمت ہیں۔"

مولانا کا پہلا فقرہ کہ "میں خود اس کے متعلق دوسری رائے رکھتا ہوں" یہ تو وہی عالم قدس کی واردات ہیں لیکن ہمکو اس عالم سے بحث ہے جس میں مولانا عالم ملکوت سے تنزل فرماکر ندوہ کے ارکان میں شامل ہوتے ہیں، اور ندوہ کی تجاویز اور ریزولیوشن وغیرہ منظور یا نامنظور فرماتے ہیں، اس عالم میں مولانا کا بھی ارشاد یہی ہے کہ ایسے مضامین کی اشاعت ندوہ کے مقاصد و اغراض کے خلاف ہے، اگرچہ افسوس ہے کہ ندوہ کے اغراض و مقاصد جو علیحدہ چھپ کر شائع ہوچکے ہیں، اس میں اس مقصد کا جو مولانا بیان کرتے ہیں، کہیں ذکر نہیں مولانا نے اس سے اوپر کی عبارت میں ایک موقع پر فرمایا ہے:۔

"ندوہ کی غرض اگر صرف تعلیم دینی ہوتی تو کوئی پروا نہ تھی، مگر اس وقت اس کے مقاصد میں گورنمنٹ کا خوش رکھنا بھی ہے۔"

ندوہ کے اغراض و مقاصد جو کل پانچ ہیں ایک چوورقہ پر جلی خط میں چھپکر کثرت سے شائع ہوچکے ہیں، اور اب تک شائع ہوتے رہتے ہیں، مولانا کئی برس سے ندوہ کے ممبر ہیں، اور اکثر جلسوں میں شریک ہوتے رہے ہیں، اور ایک زمانہ ایسا بھی گذرا ہے، جب مولانا کی

بعض ناکام کوششوں سے لوگوں کو یہ امید بندھی تھی کہ اس کی سکریٹری شپ کو عزت دینے کے لئے آمادہ ہیں، اس لئے مولانا کی خدمت میں بہ ادب گذارش ہے کہ گورنمنٹ کا خوش رکھنا ندوہ کے مقاصد پنجگانہ میں سے کون سا مقصد ہے؟

اخیر بحث مولوی عبد الکریم صاحب کی معطلی کی ہے، اس کی نسبت مولانا ایک طول طویل تقریر کے بعد فرماتے ہیں :۔

"میں نے کہا معطل کرنا ہمارے اختیار میں نہیں ہے اُس پر بحث ہونے سے معلوم ہوا کہ ناظم کو اختیار رہے، اس پر مولوی شبلی صاحب نے فرمایا کہ اچھا آپ (مولوی عبد الحی صاحب) معطلی کا حکم لکھدیں، مولوی عبد الحیٔ صاحب نے اسکو منظور کیا میں ہرگز نہیں سمجھ سکتا ہوں کہ معطلی کس طرح ہماری طرف منسوب ہوگئی"

مولانا کی اس تصریح سے اس قدر ثابت ہے کہ معطلی کا حکم دینا مولوی عبد الحیٔ صاحب نے منظور کیا تھا، ان کو بوجہ اس کے کہ نائب ناظم ہیں، یہ اختیار حاصل تھا لیکن مولانا کو شاید یہ معلوم نہیں کہ جب کسی انجمن کا کوئی عہدہ دار اپنے حد جواز سے انجمن کے اجلاس میں بحیثیت اپنے عہدہ کے کوئی حکم دیگا، تو وہ انجمن کی طرف سے سمجھا جائیگا، جب تک کہ کوئی ممبر اس حد جواز کا منکر نہ ہو یا ممبری سے کنارہ کش نہ ہوجائے،

اخیر میں مجھکو سخت تعجب یہ ہے کہ مولانا کی اس قدر مفصل شہادت اور بیانات کا جلسہ انتظامیہ ۹ ر مارچ ۱۹۱۳ء کی روداد میں جس میں مولانا شریک تھے اور چھپ کر شائع ہوچکی تھی کہیں ذکر نہیں ہے مولانا کو یہ بیانات یا اس کے اہم ٹکڑے اس جلسہ کی روداد میں درج کرانے چاہئیں تھے تاکہ سب پر حجت ہوسکتی، روداد مذکور سے تو ظاہر ہوتا ہے، کہ (بجز ایک خاص نقطہ کے) باقی تمام ارکان خمسہ تمام کارروائیوں میں شریک تھے، اور اس لئے

ان کارروائیوں کے متعلق جہاں لکھا گیا ہے کہ کالعدم قرار دی گئیں، وہاں یہ الفاظ ہیں:۔

"اس جلسہ کی کارروائی میں کل کارروائی جلسۂ غیر معمولی منعقدہ ۸؍ جنوری ۱۹۱۳ء کو کارروائی معتمد صاحب دار العلوم نسبت معطلی مولوی عبد الکریم صاحب خلاف دستور العمل ندوۃ العلما بغیر کسی اختیار کے عمل میں لائی گئی ہے، لہذا کالعدم سمجھی جائے۔"

عبارت مذکورہ میں یہ امر بھی خصوصیت کے ساتھ قابل لحاظ ہے کہ اس جلسہ نے جلسۂ غیر معمولی کی جو کارروائی کالعدم قرار دی، اسکی وجہ یہ نہیں بیان کی کہ وہ نامناسب اور بیجا تھی، بلکہ یہ بیان کہ دستور العمل کے رو سے اس جلسہ کو اس کارروائی کا اختیار حاصل نہ تھا، کیونکہ دستور العمل کے رو سے جلسۂ انتظامیہ کے سوا کسی جلسہ کو کوئی اختیار حاصل نہیں ہے، اور جلسۂ انتظامیہ کیلئے سات ممبروں کے جمع ہونے کی شرط ہے، اور اس جلسۂ غیر معمولی میں صرف پانچ ممبر شریک تھے،

بہر حال مولانا کے اظہار سے کچھ نہ کچھ اصل حقیقت ظاہر ہوئی ہے، اور اگر بقیہ ارکان اربعہ بھی اپنے بیانات شائع کر دیں تو اصل حقیقت قطعاً منکشف ہو جائیگی، اور اب تک تو جن لوگوں نے جو کچھ بطور شہادت کہا ہے، سب وہ لوگ ہیں جن کا بیان استراق سمع سے زیادہ نہیں،

(۲۴ مئی ۱۹۱۳ء از وکیل)

اسٹرایک کا سبب کون تھا؟

اسکندریہ کا کتب خانۂ قدیم جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے پہلے قائم ہوا تھا، عیسائیوں نے عہدِ ظلمت میں برباد کر دیا لیکن جب اس بدنامی کا احساس ہوا تو اس الزام سے بچنے کا سب سے بڑا حیلہ جو انھوں نے ایجاد کیا وہ اس الزام کا مسلمانوں کے سر منڈھ دینا تھا، چنانچہ ایک مدت تک تمام یورپ میں یہ اتہام اور افترا، صدائے حق بن کر گونجا کیا،

اسٹرایک کی تحقیق کرنے کا یہ طریقہ تھا کہ پہلے طلبہ کا خود اظہار لیا جاتا، پھر مدرسین کی شہادت لیجاتی، جو ہر حیثیت سے اعتبار کے قابل تھی، طلبہ نے مدرسین کو عرضِ حال میں اپنا فریق بنا لیا ہے، مدرسین کی ایک کافی جماعت ہے، ان میں متعدد ایسے ہیں، جن کا صدق اور راستی بے لوث ہونے پر خود مخالف پارٹی کو بھی اتفاق ہے، اس بنا پر ان کا بیان ہر طرح پر طلبہ کی جانبداری سے آزاد ہوتا، اس کے ساتھ ان شکایتوں کی تحقیق کیجاتی جو طلبہ نے پیش کیں جن سے اندازہ ہوسکتا کہ وہ اسٹرایک کا سبب ہوسکتی ہیں یا نہیں؟

لیکن ان سب کے بجائے صرف یہ کیا گیا کہ دو خط پیش کئے گئے جن سے یہ ثابت کیا گیا کہ اسٹرایک کا محرک اور بانی فلاں شخص یعنی "میں" تھا،

پہلا خط عبدالسلام کا ہی جو ایک فارغ التحصیل طالب العلم کے نام ہے، اس خط میں یہ بھی لکھا ہے کہ یہ خط "میرے" ایما سے لکھا گیا، بے شبہہ یہ خط نہایت بیہودہ، سفیہانہ

بلکہ مجنونانہ ہے، میں نے اصل خط اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھا ہے، لیکن بہر نوع جس کا خط ہو
میں صرف یہ کہنا کافی سمجھتا ہوں کہ اگر یہ خط میرے ایمارسے لکھا گیا، یا اب بھی میں اسکو جائز سمجھتا
ہوں تو میں دائرۂ اسلام سے خارج ہوں، لَعْنَۃُ اللہِ عَلَی الْکَاذِبِیْنَ

دوسرا خط خاص میرا ہے، اور بے شبہہ مجھ کو تسلیم ہے کہ وہ میرا ہی ہے، لیکن یہ ظاہر ہے
کہ اس کو اسٹرائک سے کوئی تعلق نہیں ہے، چنانچہ وہ خط دفترِ نظامت نے روداد میں شائع
کر دیا ہے، اسکو پڑھ کر ہر شخص اندازہ کر سکتا ہے، کہ اس میں ندوہ کے اصلاح کے طریقۂ عمل کے سوا
اور کچھ نہیں، بے شبہہ یہ میرا خط، میری رائے اور میری استدعا ہے لیکن میں نہیں سمجھ سکتا کہ اس
خط کو اسٹرائک سے کیا تعلق ہو سکتا ہے! اسٹرائک کا اصل سبب دریافت کرنا ہو تو ندوہ کے
موجودہ دور کے سلسلۂ واقعات کو پیشِ نظر رکھئے، دارالعلوم کے طلبہ میں سے ایک ایک بچہ
جانتا اور سمجھتا ہے کہ وہ قدیم عربی مدارس اور کسی انگریزی اسکول کو چھوڑ کر ندوہ میں کیوں پڑھتا
ہے، وہ جانتا ہے کہ ندوہ کا نصب العین دونوں سے کوئی الگ چیز یا دونوں کا مجموعہ ہے،
طلبہ اس طرز تعلیم اور ان خیالات کے مدت سے عادی ہو چکے تھے، جن صاحب کے ہاتھ میں
اب ندوہ کی باگ ہے، طلبہ ایک مدت سے ان کے مبلغِ علم، ان کے اشتغال، ان کے مزاج،
ان کے اندازِ طبیعت سے واقف تھے، طلبہ یہ بھی جانتے تھے کہ مجلس انتظامی خود کوئی چیز نہیں
بنا ناظم جو کچھ چاہتا ہے کرتا ہے، ایسی حالت میں انھوں نے دیکھا کہ دفعۃً ان کی قسمت کس
شخص کے ہاتھ میں آگئی ہے! لیکن انتظامی امور میں کچھ دخل دینا ان کے منصب سے بالاتر تھا،
اس لئے انھوں نے خاموشی کے ساتھ گوارا کیا، لیکن چند ہی روز کے بعد انھوں نے دیکھا کہ
طرز تعلیم بالکل بدل گیا ہے، عربی تقریر کرنے کی مشق، مسائل علمی پر خطبہ دینا، جدید زبان عربی
کے وسائلِ تحصیل، فن تفسیر کے ساتھ خاص اعتنا، یہ سب مفقود ہو گیا ہے، وہ یہ بھی دیکھتے تھے کہ

پرنسپل کے اختیارات بالکل فنا ہو گئے ہیں، اور سب سے بڑھکر یہ کہ "مجلس دار العلوم" جو تعلیمی نصاب کی ذمہ دار ہے اور وہی ہر قسم کے تعلیمی انتظامات کا حق رکھتی ہے، اس کا اجلاس بھی آج تک نہ ہوا، بلکہ صرف ایک ذات واحد خود مختارانہ ندوہ کے تعلیمی اوراق اُلٹ پلٹ رہی ہے،

یہ خود مختاری اس حد تک پہنچی کہ بخاری شریف کا سبق جو طلبہ مدرسہ سے باہر پڑھتے تھے روک دیا گیا، یہ حکم اس قدر ناموزوں تھا کہ جب پرنسپل صاحب سے اس کی تعمیل کرانے کے لئے کہا گیا تو وہ کئی دن تک لیت و لعل کرتے رہے، اور خود مجھ سے آکر کہا کہ میں کیا کروں، مجھکو یہ حکم دیا جاتا ہے، میں نے کہا کہ آپ ناظم صاحب سے تحریری حکم لکھوا لیجئے اور اسکی تعمیل کیجئے، لیکن حکم دینے والا اس حکم کی ناموزونی کا خود دل میں احساس کرتا تھا، اس لئے پرنسپل صاحب سے کہا گیا، کہ آپ خود تحریری حکم دیدیں، مجبور ہو کر انھوں نے تحریری حکم دیا، چونکہ بخاری شریف کا سبق "میں" پڑھاتا تھا، اور خاص میرے نام سے حکم دینا مصلحت کے خلاف تھا، اس لئے یہ حکم اس صورت میں دیا گیا کہ طلبہ کوئی سبق کسی سے خارج از مدرسہ نہ پڑھنے پائیں، بہت سے طلبہ ایسے تھے، جو باہر کے استادوں سے اپنی ناغہ شدہ کتابیں پڑھتے تھے، بہت سے ایسے تھے جو اپنی صف میں کمزور ہونے کی وجہ سے باہر کے اساتذہ سے سبق کا اعادہ کرتے تھے، اس امتناعی حکم نے دفعۃً طلبہ کے ایک گروہ کثیر کو تحصیل علم سے محروم کر دیا، طلبہ کے سامنے اب یہ مناظر پیش نظر ہیں، بخاری کا مقدس درس صرف ایک شخص کی ضد سے روک دیا گیا ہے، طلبہ تمام بیرونی اسباق سے روک دیئے گئے ہیں، اور یہ حکم دیا گیا ہے، کہ جو طلبہ بخاری شریف پڑھنے جاتے ہیں، ان کا نام مدرسہ سے خارج کر دیا جائے، طلبہ عاجزانہ درخواستیں دے رہے ہیں، اور کچھ شنوائی نہیں ہوتی، طلبہ مقامی ارکان کے پاس جاتے ہیں، اور ہر جگہ سے صدائے "دور باش" آتی ہے،

عین اسی حالت میں مولود شریف کا زمانہ آیا، اور طلبہ نے جیسا کہ ہمیشہ سے معمول تھا، مولود شریف کرنا چاہا، لیکن اس خیال سے کہ مولود شریف" میں "بیان کروں گا، وہ مولود سے روکے گئے، اور تین دن تک یہ مرحلہ رہا، آخر لوگوں نے سمجھایا کہ مولود کے روکنے سے شہر میں عام برہمی پھیلے گی، مجبوراً چند شرطوں اور قیدوں کے ساتھ مولود کی منظوری دی گئی، اس کے بعد اور اور واقعات پیش آئے، جو اخبارات میں آچکے ہیں، کیا یہ تمام واقعات اس بات کے لئے کافی نہیں کہ طلبہ ایسے جابرانہ احکام گوارا نہ کرسکیں، میں ایماناً کہتا ہوں کہ میں نے طلبہ کو اسٹرائک سے روکا، بخاری شریف کا جب سبق بند کیا گیا، تو عبد الخالق ایک طالب علم میرے پاس روتا ہوا آیا، اور نہایت دردناک الفاظ میں بولا، کہ اب پانی سر سے گذر چکا، لیکن میں نے انکو سمجھایا کہ صبر و تحمل سے کام لو، اور اس قسم کی باتیں نہ کرو، عبد السلام کا خط بعض اخباروں میں چھپ چکا تھا، اور میں اس سے واقف ہو چکا تھا، ایک اور طالب العلم کو بھی میں نے سمجھایا کہ تم اسٹرائک کا ہرگز خیال نہ کرو، ورنہ میری نسبت سوءِ ظن پیدا ہوگا، وہ اس وقت خاموش ہوگیا، دوبارہ مولود کے واقعہ کے وقت آیا، اور پھر میں نے اس کو سمجھایا، اس نے کہا کہ ہم اپنی بدنامی کے ڈر کے مارے کب تک اپنے مذہب اور دین کی توہین گوارا کریں گے"۔

اب ان واقعات پر غور کیجئے کہ ندوہ کے طلبہ دولت مند اور خوش حال نہیں ہیں ۲۰-۲۲ لڑکے بالکل نادار ہیں، جو ندوہ سے وظیفہ پاکر بسر کرتے ہیں، باقی ایسے ہیں کہ بمشکل چھ روپیہ مہینہ کھانے کی قیمتیں ادا کرتے ہیں، ان کو معلوم تھا کہ اسٹرائک کے ساتھ وہ دفعۃً مالی مدد اور ہر قسم کے آرام سے محروم ہو جائیں گے، نادار طلبہ کا کوئی ٹھکانا نہیں ہوگا، تعلیم و تعلم کا سلسلہ بالکل بند ہو جائیگا، شہر میں ان کا کوئی خبر گیراں اور حامی نہیں، اس حالت میں کیا صرف عبد السلام کا خط۔ یا میری کشمکش انکو ایسی حیرت انگیز خودکشی پر آمادہ کرسکتی تھی

پھر یہ خودکشی ایک دو دن کی نہ تھی، بلکہ پورا ایک مہینہ ہو چکا ہے، اور اب تک قائم ہے۔
زمانہ میں طلب حقوق کی جو عام ہوا چل رہی ہے، اسٹرائک کے عظیم الشان واقعات جو
علی گڈھ، آگرہ، لکھنؤ، لاہور میں پیش آچکے ہیں، اور آزادی کا جو مذاق عام ہو رہا ہے، صحیح ہو
یا غلط لیکن کیا اس سے کسی درسگاہ کے طلبہ بے اثر رہ سکتے ہیں؟ آپ جس کو اسٹرائک
کہتے ہیں وہی چیز دوسروں کی نظر میں حقوق طلبی کی صورت میں جلوہ گر ہوتی ہے تاریخوں میں
یہ پڑھ کر کہ فاروق اعظم کو عین منبر پر ایک شخص نے یہ جواب دیا تھا کہ اگر تم ٹیڑھے چلوگے
تو تلوار سے تمہارا بل نکال دوں گا کسی کو یہ خیال نہیں آتا کہ یہ اسٹرائک یا بغاوت تھی بلکہ
یہ آزادانہ فطرت اسلام کی تاریخ کے طغرائے امتیاز ہیں، ان حالات کے ساتھ بخاری شریف
کے درس اور مواد کے روکنے پر اسٹرائک کر دینا کون سی تعجب کی بات ہو سکتی ہے، کیا
آپ یہ سمجھتے ہیں کہ ندوہ میں جو قیامت انگیز اور شرمناک بدعملیاں ہو رہی ہیں، ان پر صرف
عبدالسلام کے خط کا پردہ ڈال دیا جا سکتا ہے، اور پھر وہ ہمیشہ کے لئے نظر سے اوجھل ہو جائینگی؟

(ہمدرد، دہلی، ۶ر اپریل ۱۹۱۴ء)

اصلاحِ ندوہ

اور

ہمدرد

بخدمت اڈیٹر صاحب "ہمدرد" دہلی،

"ہمدرد" کے پرچہ مورخہ ۲۴ اپریل ۱۹۱۴ئہ میں جو آرٹیکل "اصلاحِ ندوہ" کے نام سے نکلا ہے، اسکے اعتدال اور میانہ روی اور نیک نیتی کا مجھکو دل سے اعتراف کرنا چاہیئے، اڈیٹر صاحب تسلیم کرتے ہیں کہ "ہم اپنا فرض ادا کرنے سے قاصر نہ رہیں گے، اگر ہم یہ کہیں کہ ندوہ کو اس کے حال پر چھوڑ کر ان تمام عظیم الشان مقاصد کو خاک میں ملا دیا جائے، جس کے حصول کی غرض سے اپنی قسم کا یہ پہلا انسٹیٹوشن ہندوستان میں قائم کیا گیا تھا لیکن وہ لکھتے ہیں کہ اصلاح کے دو طریقے ہیں، ایک یہ کہ پہلے جمہور قوم کی جانب سے خواہ جلسوں کے ذریعہ سے یا فرداً فرداً ندوہ کے موجودہ ارکین کے سامنے اصلاح کا پروگرام پیش کیا جائے اور خواہش کیجائے کہ وہ اپنے اُس بڑے قومی انسٹیٹوشن میں قوم کی آواز کا لحاظ کریں، پھر وہ لکھتے ہیں کہ پہلے یہ طریقہ اختیار کرنا چاہیئے، جب اس طریقہ سے اصلاح ناممکن ہو تب دوسرا طریقہ (یعنی جوش کے ذریعہ سے کارکنانِ ندوہ کو مجبور کرنا) اختیار کیا جائے،

ہم مختصراً عرض کرتے ہیں کہ آج بھی جلسۂ دہلی میں وہی پہلا طریقہ مقصود ہے جس کی آپ نے

ہدایت کی ہے، لیکن اڈیٹر صاحب اور عام پبلک کو یہ معلوم نہیں کہ یہ طریقہ پہلے اختیار کیا جا چکا ہے، وہ

سمجھتے ہیں کہ پہلے کبھی اس قسم کی خواہش نہیں کی گئی، اور اس دفعہ دفعتہً جبر یہ طریقہ اختیار کرنا مقصود ہے

لیکن یہ دونوں باتیں غلط ہیں حقیقتِ حال یہ ہے کہ ندوہ میں یہ خرابیاں مدت سے ہیں اور

میں نے بارہا فرداً فرداً اور اجتماعی طریقہ سے اس کی طرف توجہ دلائی، دو سال ہوئے کہ میں نے

ایک مطبوعہ خط تمام ارکان کی خدمت میں بھیجا کہ موجودہ خرابیاں اس وجہ سے ہیں کہ ندوہ میں

دو نہایت مختلف الخیال اور مختلف المذاق قسم کے ممبر ہیں، اس لئے دونوں کی کشمکش کی وجہ سے

کسی امر کی اصلاح نہیں ہوسکتی، اس بنا پر یہ مناسب ہوگا کہ یورپ کے قاعدہ کے موافق ایک

مدتِ معین تک ایک مذاق کے تمام ممبر کام سے دست بردار ہوجائیں، اور تنہا ایک فریق کو

کام کرنے دیا جائے، اور سب سے پہلے میں خود اور میرے ہم خیال اس کے موافق دست کش

ہونے پر آمادہ ہیں لیکن یہ تجویز جلسۂ انتظامیہ میں نامنظور کی گئی،

اس کے بعد مولانا عبدالباری صاحب نے جو اس وقت ندوہ کے ممبر تھے اصلاح کی کوشش کی اور

اسی مضمون کے مطبوعہ خطوط جاری کئے اور ایک بڑا معرکۃ الآرا جلسہ ہوا لیکن اس کا نتیجہ کچھ بھی نہ نکلا

ایک جلسہ مصالحت کا ہوا تھا جس میں ارکانِ ندوہ کے علاوہ بعض اور معزز حضرات بھی شریک تھے

۱۸ اور ۱۹ اور ۲۰ جولائی ۱۹۱۳ء کو دفعتہً وہ انتظامات عمل میں آئے جس سے دورِ جدید کا آغاز ہوتا ہے،

اس جلسہ میں بغیر اس کے کہ ایک منٹ قبل باہر کے ارکان کو خبر کیجائے تین سکریٹریاں

جو پہلے مدت سے قائم تھیں، اور ندوہ کے تمام کام انہی کے ذریعہ سے انجام پاتے تھے اور

جن پر اعتماد کا ووٹ بار بار جلسۂ انتظامیہ میں بھی پاس ہوچکا تھا، توڑ دی گئیں یہ کارروائی چونکہ ندوہ

کے دستورالعمل کے رو سے بالکل بے قاعدہ تھی، اس لئے بارہا اس کی طرف ارکانِ مقامی کو توجہ

دلائی گئی اور بعض اخبارات میں نہایت تفصیلی مضامین لکھے گئے، لیکن کسی نے پروا تک نہ کی،
بقول اڈیٹر صاحب کے جوش اور شور وغل اور ہنگامہ آرائی سب سے آخری علاج ہے لیکن مجھ کو میرے
دوست بتائیں کہ قومی احساس کا کیا حال ہے؟ کیا ہندوستان کے کسی معاملہ پر پبلک نے سرد
اور معتدل آوازوں پر توجہ کی ہے، پولیٹکل معاملات، یونیورسٹی ڈیپوٹیشن، علی گڈھ کالج میں سکرٹری
اور اسٹاف کی قوت کا موازنہ، انجمن حمایت الاسلام کی اصلاح اور تقسیم عمل، اس میں سے کون سی چیز
ایسی ہے جو بغیر ہنگامہ آرائی اور شور وغل کے انجام پائی،

ان واقعات کے ساتھ فقط غریب ندوہ پر کیوں الزام ہے؟ کیا اسی لئے کہ وہ دولتمند
اور امرا کا انسٹیٹیوشن نہیں ہے؟ لیکن بایں ہمہ اب بھی اوس پہلے طریقہ پر عمل کرنا مقصود ہے
جو بار بار استعمال کیا جاچکا ہے، اور جس کی نسبت اڈیٹر صاحب ہمدرد ہمکو مشورہ دیتے ہیں، کہ
پہلے ہم کو اس سے کام لینا چاہئے، (گویا ہمنے اب تک اوس سے کام نہیں لیا ہے)

(ہمدرد دہلی، یکم مئی ۱۹۱۴ء)

جلسۂ دہلی کے متعلق ایک عام غلط فہمی کی تردید

یہ خیال غلطی سے عام طور پر پھیل گیا ہے کہ دہلی میں ندوہ کی اصلاحی تجویز کے متعلق جو جلسہ ہونے والا ہے وہ موجودہ کارکن اشخاص کی مخالفت اور ان کے ساتھ معرکہ آرائی کا جلسہ ہے، اس غلط خیال نے تمام پبلک میں ایک اشتعال آمیز (مخالف یا موافق) جوش پیدا کر دیا ہے، قومیں جب ابتدائی ترقی کے دور میں ہوتی ہیں، تو ان کا مذاق طبع ہر بات میں اشتعال انگیز پہلو کو ڈھونڈتا ہے، اور اس سے متاثر ہو کر اصل حقیقت کو نظر انداز کر دیتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ ندوہ کے چند امور مسلمہ فریقین ہیں، یہ امر کہ ندوہ میں کچھ خرابیاں ہیں، دونوں فریق کو تسلیم ہے، یہ امر کہ ان خرابیوں یا اصل قانون ندوہ میں اصلاح کی حاجت ہے، دونوں کو تسلیم ہے، گفتگو صرف یہ ہے کہ یہ خرابیاں کس نے پیدا کیں؟ اور اب ان کی اصلاح کا کیا طریقہ ہے؟ یہ ظاہر ہے کہ ہر فریق دوسرے فریق کو خرابیوں کا ذمہ دار بتاتا ہے، اور اگرچہ اس میں شک نہیں کہ اگر کوئی آزاد کمیشن بیٹھتا تو یہ مسئلہ صاف ہو جاتا، لیکن بہرحال ایسا کرنے میں مخالفت اور جوش کا زیادہ احتمال ہے، اس لئے سر دست اسی نقطہ کو پیش نظر رکھنا چاہیے کہ خرابیاں کیا ہیں؟ اور اصلاح کا کیا طریقہ ہو سکتا ہے؟

طریقۂ اصلاح کے متعلق ایک یہ غلط خیال پھیلا ہوا ہے کہ خود ندوہ کے جلسۂ انتظامیہ میں یہ خرابیاں پیش کی جا سکتی ہیں اور وہ خود ان کی اصلاح کر سکتا ہے، لیکن واقعات یہ ہیں کہ

جس زمانہ سے یہ خرابیاں اور بے ضابطگیاں ہیں، اس زمانہ سے یہ مسئلہ بارہا ندوہ کے ارکان کے سامنے آچکا ہے، سب سے پہلے ندوہ کے اصل قانون کا معاملہ ہے، دونوں فریق قانون کی بعض دفعات کی لغویت اور بداثری کو تسلیم کرتے ہیں، اس بنا پر متعدد جلسہ ہای انتظامیہ میں اس کی اصلاح کی خواہش کی گئی اور ہر صیغہ کے سکریٹری نے جن دفعات کو صاف کرنا یا ترمیم و تنسیخ کرنا ضروری سمجھا، اس کے متعلق اپنی تحریری رائیں لکھ کر بھیجیں، ایک جلسۂ انتظامیہ میں طے ہوا کہ مولوی ظہور احمد صاحب وکیل کے پاس یہ تمام رائیں بھیجی جائیں اور وہ سب کو غور سے پڑھ کے ایک مسودہ طیار کریں جو جلسۂ خاص میں پیش کیا جائے، دو برس گذر جانے پر بھی کچھ کام نہیں ہوا، آخر مولوی صاحب موصوف سے لے کر ایک اور ممبر صاحب کے حوالہ کیا گیا، اور پھر بھی کچھ نہ ہوا، اسی بنا پر یہ کہنا صحیح نہیں کہ خود ندوہ سے اصلاح کی خواہش نہیں کی گئی،

دیگر معاملات کے متعلق تین دفعہ سرگرم کوششیں ہوئیں، ایک دفعہ مولوی عبدالباری صاحب نے جو اس وقت ندوہ کے ممبر تھے اس کی کوشش کی اور مطبوعہ خطوط جاری کئے، دوسری دفعہ مرزا ظفر اللہ خاں صاحب (رکن ندوہ) نے اصلاحی یادداشت چھاپ کر تمام ممبروں کے پاس بھیجی، میں نے بارہا اصلاحی معاملات پر توجہ دلائی، یہاں تک کہ ایک دفعہ مطبوعہ خطوط کے ذریعہ سے یہ تحریک پیش کی کہ لبرل اور کنسرویٹو گروہوں کی طرح ایک خاص مذاق کے ممبر چند برس کے لئے ممبری کے کام سے دست کش ہو جائیں، اور دوسرے فریق کو کام کرنے دیں، اور اس کی ابتدا میں نے اپنی دست کشی سے کرنی چاہی لیکن جلسۂ انتظامیہ میں یہ تجویز بھی نامنظور ہوئی،

ان واقعات کے بعد قریباً ایک سال تک اخبار وکیل نے ندوہ کے نقائص پر لیڈر

اور اور مضامین شائع کئے، لیکن پبلک کو مطلق احساس نہ ہوا،

حالات مذکورہ کے بعد کیونکر کہا جا سکتا ہے کہ اصلاح کی خواہش کی یہ پہلی صدا ہے اور اس سے کسی فریق کی توہین یا تذلیل مقصود ہو،

دہلی کے جلسہ کا یہ پروگرام ہے کہ دونوں فریق الگ الگ اصلاحی پروگرام مرتب کر کے لائیں، ان میں جن اصلاحات پر دونوں فریق کا اتفاق ہو وہ اسی وقت جلسہ میں مشتہر کر دی جائیں، جن میں اختلاف ہو، ان کے تصفیہ کے لئے جلسہ کی طرف سے ایک سب کمیٹی مقرر کر دی جائے، اس میں ندوہ کے ارکانِ انتظامی بھی ممبر بنائے جائیں،

اس بات کا خاص طور پر لحاظ رکھا جائے کہ ایسے مباحث نہ پیش ہوں جن سے ذاتیات، معرضِ بحث میں آئیں، بلکہ ان امور کو لے لیا جائے جن کا تعلق ندوہ کے اصل قانون اور دستور العمل سے ہے، اور جن کے فیصلہ کے لئے جزئی واقعات کے تحقیق کرنے کی ضرورت نہ ہو، بلکہ خود قانون کا مطالعہ ان کا فیصلہ کر سکے، مثلاً یہ بحث کہ موجودہ کارکن اور عہدہ دار واقعی عہدہ دار مجاز ہیں، یا نہیں، واقعات کا چنداں محتاج نہیں، بلکہ اصل قانون پر نظر ڈالنا کافی ہو سکتا ہے، اور جس قدر واقعات کی شہادت اس کے لئے درکار ہے وہ کھلے ہوئے اور نمایاں واقعات ہیں مسلمانوں کی موجودہ بیداری کا سب سے نمایاں واقعہ عام قومی اجتماع ہے لیکن اگر اس دور میں بھی کوئی قومی انسٹیٹیوشن صرف چند اشخاص کے ہاتھ کا بازیچہ بن کر رہجائے، تو قومی زندگی کی طرف سے بالکل مایوس ہو جانا چاہئے،

ارکانِ ندوہ کے علاوہ جو لوگ اس مسئلہ کو قوم میں لانے کے مخالف ہیں، صرف دو قسم

کے لوگ ہیں، یا وہ ہیں جو آج ۲۲۔ برس سے ندوہ کے مخالف، اور اس کے وجود کے دشمن ہیں ان کو اس سے بڑھکر کیا خوشی ہو سکتی ہی، کہ ندوہ کل کا تباہ ہوتا ہوا، آج تباہ ہو جائے، یا وہ لوگ ہیں جو خود کسی انسٹیٹیوشن پر اسی طرح خود مختارانہ قابض ہیں، اور ڈرتے ہیں کہ اس آگ کے شعلے پھیلتے پھیلتے ان کے گھر تک نہ پہونچ جائیں، فقط،

(زمیندار روزانہ، ۲ر مئی ۱۹۱۴ء)

دار العلوم ندوہ

کی

ایک اور خصوصیت

ہندوستان میں آج جس قدر عربی مدارس موجود ہیں اور جن کی تعداد سینکڑوں ہزاروں تک پہنچ گئی ہو، ان میں جو طلبہ تعلیم پاتے ہیں صرف وہ ہیں جن کو مدرسہ کی طرف سے کھانا کپڑا ملتا ہے، یا مدرسہ کی سفارش پر دوسری جگہوں سے کھانا مقرر ہو جاتا ہو، اس واقعہ سے متعدد نتائج حاصل ہوتے ہیں،

(۱) عربی کی تعلیم صرف ان لوگوں میں محدود رہ گئی ہے، جو افلاس کی وجہ سے اور کسی قسم کی تعلیم حاصل نہیں کر سکتے،

(۲) عربی تعلیم ایسی بے کار شے سمجھی گئی ہو کہ بغیر اس قسم کی ترغیب دینے کے کوئی شخص اس کی طرف متوجہ نہیں ہو سکتا،

(۳) ان مدارس میں اس قسم کا انتظام نہیں کہ ذی وجاہت لوگ اپنی اولاد کو وہاں بھیجنا گوارا کریں، اور اس لیے امراء کا گروہ عربی اور مذہبی تعلیم سے قطعاً محروم ہوتا جاتا ہے،

(۴) چونکہ صرف غریب لوگ عربی تعلیم حاصل کرتے ہیں، اور ان کی تمام حاجات

میں ایک شخص بھی خوشحال اور صاحب جاہ و دولت نہیں ہوتا، اس لئے اس گروہ کے خیالات اور ہمتیں پستی کی طرف مائل ہوتی ہیں، اور یہی وجہ ہے کہ کوئی بڑا اولوالعزم شخص اس گروہ میں نہیں پیدا ہوتا،

لیکن دارالعلوم ندوہ کی یہ عجیب خصوصیت ہے کہ اس میں دوثلث کے قریب طلبہ ہیں جو اپنے مصارف کے آپ متکفل ہیں، اور اگر دارالاقامہ دبورڈنگ ہاؤس) میں گنجائش ہوتی، تو اس قسم کے طلبہ کی تعداد اور بہت زیادہ ہو جاتی،

اس واقعہ سے متعدد امور ثابت ہوتے ہیں،

(۱) یہاں کی عربی تعلیم میں کچھ ایسی خصوصیت ہے کہ دولت مند اور خوش حال لوگ بھی اس کو بیکار نہیں سمجھتے،

(۲) یہاں کے دارالاقامہ میں ذی وجاہت لوگ بھی اپنی اولاد کا بھیجنا گوارا کرتے ہیں،

(۳) دارالعلوم سے بہت بڑا فائدہ یہ متوقع ہے کہ دولت مند گروہ میں بھی عربی اور مذہبی تعلیم بقدر ضرورت رواج پائے،

اگرچہ بعض لوگوں کے نزدیک یہی امر ندوہ کے بڑے ہونے کا بڑا ثبوت ہو سکتا ہے، کیونکہ وہ لوگوں کو ضروری تعلیم (یعنی انگریزی) سے روک کر، ایک بیکار چیز میں پھنساتا ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ عربی تعلیم اگر صحیح اصول پر ہو تو وہ انگریزی تعلیم کی سدراہ نہیں بلکہ اور اس کے لئے راستہ صاف کرنے والی ہوگی،

آج تیس۳۰ برس سے انگریزی تعلیم کا غل برپا ہے، باوجود اس کے ایک نہایت قلیل تعداد نے اس طرف توجہ کی ہے، لیکن اگر علماء، انگریزی تعلیم کے طرفدار بنجاتیں،

تو دفعۃً قوم کی قوم کا رخ پھر جائے، دار العلوم ندوہ کا مقصد اسی قسم کے علما رتیار کرنا ہے، جو ایک طرف عربی اور مذہبی تعلیم کی حفاظت میں کوشش کریں، اور دوسری طرف دنیوی تعلیم کی طرف بھی لوگوں کو رغبت دلائیں،

در کفے جام شریعت در کفے سندان عشق
ہر ہوسناکے نداند جام و سنداں باختن

(الندوہ، نمبر ۱ جلد ۳،
شوال ۱۳۲۴ھ مطابق ماہ نومبر ۱۹۰۶ء

علمی گروہ

صوفیانِ مستند و زاہدِ بے خبر — از کہ پرسم من رہِ میخانہ را

ہمارے رفارمروں نے جب جدید تعلیم کی بنیاد رکھنی چاہی تو ضروری سمجھا کہ پہلے قدیم عمارت ڈھا کر سطح ہموار اور درست کر لی جائے، ہم نے اس کو منظور کیا، پرانی تعلیم (جس قدر ہم سے ہوسکا) عملاً مٹا دی گئی، اور چونکہ خطرہ تھا کہ قدامت پرست لوگ منہدم شدہ عمارت نئے سر سے نہ اٹھائیں، اس لئے ضرور ٹھہرا کہ دلوں سے بھی اس کی عظمت کا نقش مٹا دیا جائے، اس بنا پر ہم نے اس کو افسانہ پارینہ، تقویم کہن، عضوِ شل، آبِ جامد وغیرہ وغیرہ مختلف خطابات دیئے، اور اس طرح بار بار دہرایا کہ قدیم تعلیم بھی بول اٹھی کہ

بہ من چنداں گنہ از بدگمانی میکند نسبت — کہ من ہم در گماں افتادہ پندارم گنہگارم

تیس برس کا زمانہ گذر گیا، قدیم تعلیم مرچلی، نئی نسلیں تیار ہوئیں، ہزاروں بی اے نکلے سینکڑوں نے ایم اے کی ڈگریاں لیں یہ سب کچھ ہوا، لیکن نتیجہ؟

کیا کوئی علمی جماعت پیدا ہوئی؟ کوئی مسئلہ حل ہوا؟ کسی نے کچھ اجتہاد کیا؟ کوئی مصنف پیدا ہوا؟ قومی منبر پر کوئی خطیب نظر آیا؟ کسی کے قلم نے انشا پردازی کے معرکے فتح کئے؟

تم کہو گے کہ یہ ہماری نا انصافی ہے ایک نو عمر گروہ سے ایسے فتوحاتِ عظیمہ کی توقع خود ہماری خام خیالی ہے، بے شبہہ تم سچ کہتے ہو، سوالاتِ مذکورہ کو یوں بدل دینا چاہئے،

کیا علمی مذاق کا کوئی گروہ پیدا ہوا؟ یورپ کی کسی فلسفیانہ کتاب کا ترجمہ ہوا؟ علومِ جدیدہ

کے کچھ مسائل قوم کی زبان میں شائع ہوئے کوئی علمی پرچہ نکلا؟ اسلام پر یورپ نے جو سینکڑوں نادر تصنیفات اور مضامین لکھے، اس میں سے کچھ اردو زبان میں آیا؟ تم کہوگے کہ سوالات مذکورہ کا معیار اور گھٹانا چاہیئے، ہم اس کو بھی تسلیم کر لیتے ہیں اور پوچھتے ہیں کہ یورپ نے مذہب اسلام اور اسلامی لٹریچر پر، عربی اور فارسی شاعری پر، عرب کے جغرافیہ پر، فلسفہ اسلام پر، مسلمانوں کی تاریخ پر سینکڑوں نادر کتابیں اور رسالے لکھے نئے گروہ کو ان میں سے کس قدر معلوم ہے؟ مسلمانوں کی سینکڑوں عجیب و غریب نادر تصنیفات کو یورپ نے شائع کیا ہے ان کی ان لوگوں کو خبر ہے؟ جرمنی میں مسلمانوں کے خاص علوم و فنون پر جو انسائیکلوپیڈیا لکھی جارہی ہے، کیا اس سے ان کو واقفیت ہے؟ پروفیسر ڈوزی نے دو ضخیم جلدوں میں تمام عربی مولد الفاظ کی ڈکشنری پچاس برس کی محنت میں لکھی، کیا ان لوگوں نے اس کو دیکھا ہے، گب میموریل سیریز جن کے ذریعہ سے خاص عربی اور فارسی کی قدیم نادر کتابیں شائع کی جارہی ہیں، اس سے ان کو واقفیت ہے؟

حقیقت یہ ہے کہ ہم نے اپنے علوم، اپنے فنون، اپنی تاریخ، اپنا تمدن، سب کچھ فدیہ دے کر ایک نوکری پیشہ گروہ پیدا کیا ہے، اور نازاں ہیں کہ ع

نرخ بالا کن کہ ارزانی ہنوز

لیکن ان سب حالات کے ساتھ سوال یہ ہے کہ چارۂ کار کیا ہے؟ کیا ہم کو اس درد کا علاج پرانے طریقہ کے مدارس میں ڈھونڈھنا چاہیئے؟ کیا وہاں کچھ تحقیق کا پتہ نظر آئیگا کوئی مشکل حل ہوگی؟ لفظوں کے گورکھ دھندے کے سوا اور کچھ ہاتھ آئے گا؟ قدما کی تحقیقات کا نشان ملے گا؟ ابن ہیثم نے فن مناظر پر جو اضافہ کیا، فارابی نے فن موسیقی میں جو ترقیاں کیں، خیام نے جبر و مقابلہ پر جو کچھ لکھا، ابن مسکویہ نے جو تاریخی تحقیقاتیں کیں ان میں

سے کسی چیز کا پتہ لگے گا؟ نہیں کچھ بھی نہیں، ہمارے مولویوں کے تو کان بھی ان سوالوں سے آشنا نہ ہوں گے،

غرض موجودہ حالات کے ساتھ تو ان دونوں گروہوں میں سے کوئی گروہ ہمارے کام کا نہیں، لیکن دیکھنا یہ ہے کہ کونسا گروہ کوشش کرنے سے کام کا بن سکتا ہے،

ہر قوم جب ترقی کرتی ہے تو اس میں دو گروہ پیدا ہو جاتے ہیں،

ایک وہ جو دنیوی عُلوم سیکھتا ہے، سرکاری خدمتیں حاصل کرتا ہے، انتظامات ملکی میں شریک ہوتا ہے، پالیٹکس میں دخل دیتا ہے، یہ گروہ علم و فن سے بے بہرہ نہیں ہوتا، لیکن علم اس کا مقصدِ زندگی نہیں ہوتا، ہمارے زمانے میں یہ گروہ وہی ہے جس کو ہم جدید تعلیم یافتہ گروہ کہتے ہیں،

دوسرا گروہ علمی گروہ ہوتا ہے، اُس کی غرض و غایت محض علم ہوتی ہے، وہ تھوڑی سی معاش پر اکتفا کرتا ہے اور صرف علمی خدمت کو اپنا منتہائے مقصد قرار دیتا ہے، یہ گروہ اگرچہ درحقیقت آج کل مفقود ہے، لیکن اس گروہ کے جو آثار اور خواص ہیں، وہ عربی خواں گروہ میں پائے جاتے ہیں، عربی خواں گروہ علانیہ جانتا ہے کہ عربی علوم کے پڑھنے سے معاش نہیں حاصل ہو سکتی، اور زمانے کی نظروں میں ان علوم کی کچھ قدر نہیں، تاہم یہ گروہ نہایت محویت، شوق اور شیفتگی سے علوم عربی کی تحصیل میں مصروف ہے، صرف اس لئے کہ اس نے اپنا مقصد، تحصیلِ دنیا نہیں، بلکہ تحصیلِ علم قرار دیا ہے، جو کچھ کمی ہے یہ ہے کہ وہ جس چیز کو علم سمجھ رہے ہیں وہ علم کے نہایت ابتدائی مراتب ہیں،

عربی میں جو علوم و فنون پڑھائے جاتے ہیں (دینیات کو چھوڑ کر) ان میں سے

اکثر ایسے ہیں، جن کو یورپ نے اس قدر ترقی دی ہے کہ ان کی تحقیقات کے سامنے پچھلے کارنامے بازیچۂ اطفال سے زیادہ نہیں ہے، ہیئت اور صدرا کی طبیعیات کو آج کل کی طبیعیات سے کیا نسبت ہے، عربی ادب کے متعلق یورپ نے عربی کی وہ قدیم نادر تصنیفات بہم پہنچائی ہیں جن کی ہمارے علما کو خبر تک نہیں، غرض یہی عربی خواں گروہ اگر یورپ کی کسی زبان، اور یورپ کی تحقیقات سے آشنا ہوجائے تو وہ گروہ بن جائے گا، جس کو ہم علمی گروہ کہتے ہیں، اور جس کے بغیر قوم کی قوم ع

خوب ست وخوش ست وبو ندارد،

بے شبہ آج تک عربی خواں گروہ نے انگریزی زبان اور انگریزی علوم وفنون سے احتراز کیا، لیکن کیوں؟ اس لئے نہیں کہ اُن کے نزدیک انگریزی پڑھنا کفر ہے، بلکہ اس لئے کہ ان کو یہ غلط خیال ہے کہ انگریزی میں علوم وفنون نہیں، صرف سطحی اور عامیانہ باتیں ہیں یہ اعتقاد اس قدر راسخ ہوگیا ہے کہ ہم خود ندوہ میں برسوں سے اس اعتقاد کو زائل کرنا چاہتے ہیں، لیکن کسی شخص پر کچھ اثر نہیں ہوتا جس کی وجہ صرف یہ ہے کہ ہمارے علما یورپ کے علوم وفنون کا اندازہ انگریزی خوانوں سے کرتے ہیں، اور یہ ظاہر ہے کہ اس گروہ سے یورپ کی علمی تحقیقات وتدقیقات کا اندازہ نہیں ہوسکتا،

مسلمانوں میں علمی گروہ وہی بن سکتا ہے جو اسلامی علوم کے ساتھ تحقیقات حال سے بھی ناآشنا نہ ہو چنانچہ بلاد اسلامیہ نے مدت کے تجربہ کے بعد اس نکتہ کو سمجھا، اور اسی بنا پر قاہرہ میں ایک یونیورسٹی قائم کی گئی، جس کا نام جامعہ مصریہ ہے تاہم اس یونیورسٹی میں یہ کمی ہے کہ اس میں خالص مذہبی علوم یعنی تفسیر وحدیث وغیرہ نہیں پڑھائے جاتے، اس جبر کی تلافی کی اگر اُمید ہوسکتی ہے تو حیدرآباد سے ہوسکتی

ہے، جس نے دارالعلوم کو وسیع پیمانے پر قائم کرنا چاہا ہے، ندوہ کے تہی مایہ دارالعلوم نے اسی مقصد کو پیشِ نظر رکھا ہے، اور اب اس کے کامیابی کے نہایت ابتدائی آثار نظر آنے لگے ہیں،

(الندوہ۔ جلد ۶ نمبر ۵)

جمادی الاولیٰ ۱۳۲۷ھ مطابق ماہ جون ۱۹۰۹ء

(سیاسی)

مسلمانوں کی پولیٹیکل کروٹ

(۱)

اگر یہ سچ ہے کہ تقسیم بنگال کے طمانچے سے مسلمانوں کی پالیٹکس کا منہ پھر گیا، توہم رضامند
ہیں کہ اس تقریب مسرت میں بنگال کے سوا کچھ اور بھی نثار کر دیا جائے، لیکن مرکز پالیٹکس اور
اس کے حوالی سے جو صدائیں آتی ہیں زود فنا ہونے کے ساتھ خود ان کا لہجہ بھی غلط ہے،

پائنیر کا مسلمان نامہ نگار لکھتا ہے، کہ "چونکہ اب نظر آتا ہے کہ ٹرکی اور ایران کے کمزور
ہونے کی وجہ سے ہمارا افارن رتبہ قائم نہیں رہے گا، اس لئے ہم کو ہندوؤں سے مل جانا
چاہئے" ہندوؤں سے ملنا اچھی بات ہے، لیکن یہ ہمیشہ سے اچھی بات تھی اور ہمیشہ اچھی
رہے گی، لیکن نامہ نگار نے جو جدید ضرورت بیان کی ہے، وہ اسلام کا ننگ ہے، کیا ہمکو
ہمسایوں کے دامن میں اس لئے پناہ لینی چاہئے کہ اب ہمارا کوئی سہارا نہیں رہا؟ کیا
اگر ٹرکی اور ایران پرزور ہوتے تو ہمارے ہمسایہ کے مقابلہ میں مدد کر سکتے؟ کیا شملہ ڈیپوٹیشن
کی اس فخاری پر انگریزوں کو یقین آگیا تھا کہ ہمارا پولیٹکل وزن اپنے ہمسایوں سے زیادہ ہے
نواب وقار الملک کا سنجیدہ، لیکن بہادرانہ مضمون، ایک سچے دلیر مسلمان کی آواز

ہوسکتا تھا، اگر اس میں یہ غلط منطق شامل نہ ہوجاتی کہ ہم نیشنل کانگریس میں شریک ہوجائیں گے تو
ہماری ہستی اس طرح برباد ہوجائیگی جس طرح معمولی دریا سمندر میں مل جاتے ہیں"، اگر پارسیوں کی
قوم ایک لاکھ کی جماعت کے ساتھ ہندؤوں کے ۱۹ کروڑ اور مسلمانوں کے ۵ کروڑ افراد کے
مقابلہ میں اپنی ہستی قائم رکھ سکتی ہے، اگر دادا بھائی نوروجی تمام ہندوستان کے مقابلے میں سب سے
پہلے پارلیمنٹ کا ممبر ہوسکتا ہی، اگر گوکھلے تنہا ریفارم اسکیم کی عظیم الشان تحریک کی بنیاد ڈال
سکتا ہی، تو ۵ کروڑ مسلمانوں کو اپنی ہستی کے مٹ جانے کا اندیشہ نہیں کرنا چاہئے،

غرض دلائل اگرچہ غلط ہیں لیکن بات بالکل صحیح ہے کہ پولیٹکل خواب سے بیدار ہونے
کا وقت آگیا ہے، ہمکو اچھی طرح سمجھ لینا چاہئے کہ جس چیز کو ہم پالٹیکس سمجھتے تھے، وہ پالٹیکس کی
تحقیر تھی، ہماری پالٹیکس کا کعبہ دراصل بتکدہ تھا، ہماری پالٹیکس جس کی آواز کلمۂ شہادت کی طرح
ولادت کے دن سے ہمارے کانوں میں پڑی صرف یہ تھی "ابھی وقت نہیں آیا ہی" "ابھی ہمکو
پالٹیکس کے قابل بننا چاہئے" "ابھی صرف تعلیم کی ضرورت ہے" "ہماری تعداد کم ہے، اسلئے
نیابتی اصولِ سلطنت ہمارے موافق نہیں،

یہ الفاظ اس قدر دہرائے گئے کہ قوم کی رگ وپے میں سرایت کر گئے، ہر مسلمان بچہ
ان خیالات کو ساتھ لے کر پیدا ہوتا ہے، اور زندگی کے تمام مراحل میں ساتھ رکھتا ہے مسلمانوں
کی عام جماعت میں جب پالٹیکس کا نام آتا ہے تو یہ دیکھکر حیرت ہوتی ہی کہ اچھے سے اچھا نوجوان
تعلیم یافتہ گراموفون کی طرح ان الفاظ کو دہراتا ہی،

اس کا یہ نتیجہ ہوا کہ جد وجہد سعی وکوشش، حوصلہ مندی، قوتِ عمل، سرگرمی، جوش اور
ایثارِ نفس کے لحاظ سے عام سناٹا چھا گیا، ہم سنتے ہیں کہ گروکل میں تین سو وہ تعلیم یافتہ ہیں
جنھوں نے اپنی زندگی قوم کے ہاتھ فروخت کردی ہے، اور جو باوجود دولت مندی کے

زہین پر سوتے اور کمل اوڑھتے ہیں، ہمکو معلوم ہے کہ پونا میں سرونٹس آف انڈیا سوسائٹی قائم ہے، جہاں اس وقت (۲۹) بی اے، پالٹیکس کی تعلیم پا رہے ہیں، جو پانچ برس کی تعلیم کے بعد تمام عمر ہندوستان کی خدمت کریں گے، اور ان کی کل زندگی کی قیمت صرف (۳۰) روپیہ ماہوار ہوگی، ہم واقف ہیں کہ فرگوسن کالج میں (۱۹) پروفیسروں نے جن میں سے کوئی شخص بی اے سے کم تعلیم یافتہ نہیں، صرف (۷۵) روپیہ ماہوار پر اپنی تمام عمر فروخت کردی ہے، ہم اخباروں میں پڑھتے ہیں کہ آریہ کالج اور ہندو کالج میں متعدد ہندو پروفیسر ہیں، جو بغیر کسی معاوضہ کے کام کرتے ہیں لیکن یہ تمام عبرت انگیز آوازیں، یہ تمام پرجوش نمونے، یہ تمام حیرت انگیز واقعات، ہمارے دلوں میں ایک ذرہ جنبش نہیں پیدا کرسکتے، ہماری قومی درسگاہوں نے آج تک ایثار نفس کی ایک مثال بھی نہیں پیدا کی، ہمارا قومی تربیت یافتہ گریجویٹ، قومی کام میں نرخ بازار سے ایک حبہ اپنی قیمت کم نہیں کرتا کیوں صرف اس لئے کہ ہمارا پولیٹیکل احساس بالکل مرگیا ہے

دنیا میں صرف آئڈیل (مطمح نظر) ایک چیز ہے، جو انسان کے جذبات اور احساسات کو برانگیختہ کرسکتی ہے، ہمارا آئڈیل کیا ہے؟ ہم نے کس چیز کو تاکا ہے؟ ہمارا کیا منتہائے خیال ہے؟ بی اے، اور نوکریاں، کیا اس آئڈیل سے قوم میں کسی قسم کے پرزور جذبات پیدا ہوسکتے ہیں؟ کیا اتنی سی بات کے لئے زحمتیں برداشت کی جاسکتی ہیں؟ کیا یہ مقصد کوئی بڑا ولولہ دل میں پیدا کرسکتا ہے؟ کیا اس ذوق میں فرش خاک پھولوں کی سیج بن سکتا ہے؟

اس پست مقصد سے سخت نقصان یہ ہوا کہ تمام قوم کی قوم میں پست حوصلگی، جبن بزدلی چھاگئی، ہمارے پولیٹیکل لغت نے جائز آزادی کا نام بغاوت رکھ دیا ہے، ایک پارسی یا ہندو کانگریس میں جاتا ہے، انتظام حکومت پر نکتہ چینیاں کرتا ہے، اور پھر پارلیمنٹ

اور وسیرائے کی کونسل کا ممبر باقی رہتا ہے، لیکن مسلمان ایجوکیشنل کانفرنس میں آتے گھبراتے ہیں، اور سرسید سے فتوی پوچھتے ہیں، یہاں تک کہ مرحوم کو علی گڈھ گزٹ میں مراسلہ چھاپنا پڑتا ہے، کہ تعلیمی کانفرنس میں شریک ہونا ممنوع نہیں" ہمکو معلوم ہے کہ بہت سے معزز لوگوں نے مسلم لیگ کی ممبری کے لئے یہ شرط پیش کی، کہ صاحب کلکٹر بہادر سے اجازت دلوائی جائے

جب ہم اس اختلاف حالت کا سبب پوچھتے ہیں، تو ہمارے لیڈر یہ نازک فرق ہم کو سمجھاتے ہیں، کہ ہندو بھیڑ ہیں، اس لئے گورنمنٹ کو ان کی بھن بھناہٹ کی پروا نہیں لیکن مسلمان شیر نیستاں ہیں، ان کی ہمہمہ سے جنگل دہل جاتا ہے، خیر! یہ فریب کاری ختم ہو چکی غفلت کا دور گذر چکا، قوم میں ایک احساس پیدا ہو چلا ہے، اور صرف یہ متعین کرنا رہ گیا ہے کہ نئی زندگی کا طریق عمل کیا ہوگا؟ ہم آیندہ تفصیل سے ایک ایک موضوع پر گفتگو کریں گے۔

۱۲ر فروری ۱۹۱۲ء

(۲)

اس بحث میں امور ذیل بحث طلب ہیں:-

(۱) پالیٹکس کی صحیح اسکیم، (۲) ہمارے موجودہ طریقے کی غلطیاں، (۳) ہندو مسلمانوں کا اتحاد،

اگرچہ ضرورت صرف اسی بات کے بتانے کی ہے کہ پالیٹکس کی صحیح اسکیم کیا ہے، اور یہ کہ جو طریقہ اختیار کیا گیا ہے، وہ نہ صرف بیکار ہے بلکہ اس کا یہ نتیجہ ہوگا کہ قوم ہمیشہ کے لئے پالیٹکس سے محروم رہجائے، لیکن ان باتوں کے ثابت کرنے سے پہلے یہ بتانا چاہئے کہ خود پالیٹکس کی کیا حقیقت ہے؟

"مسلمان" دو حیثیتیں رکھتے ہیں، (۱) گورنمنٹ برطانیہ کی رعایا ہیں، (۲) مسلمان

ہیں، اس بنا پر مسلمانوں کی پالیٹکس ان ہی دونوں اجزار کا مجموعہ ہے، اور ترتیباً پہلا جزو دوسرے جزو پر مقدم ہے، رعایا پر حکومت کا جو قدیم شخصی طریقہ تھا، اس کا یہ اصل الاصول تھا، اور آج بھی شخصی سلطنتوں میں قائم ہے، کہ "بادشاہ کی زبان قانون ہے، وہ جو چاہتا ہے، کر سکتا ہے رعایا کو کسی قسم کے دخل دینے کا حق نہیں" اگر تسلیم کر لیا جائے کہ انگریزی گورنمنٹ، اسی قسم کی گورنمنٹ ہے، تو تمام بحثوں کا خاتمہ ہو جاتا ہے، پر جوش نیشنل کانگریس، اور مردہ مسلم لیگ دونوں بیکار چیزیں ہیں، لیکن وہ انگلو انڈین بھی جو ہندوستانیوں کو کسی قسم کے حقوق دینے پر راضی نہیں، ان کے نزدیک بھی گورنمنٹ انگریزی کی نسبت "شخصی حکومت" کا لقب ایک قومی عار ہے، جس کو کوئی انگلش مین کبھی گوارا نہیں کر سکتا، اب انگریزی گورنمنٹ شخصی نہیں تو پارلیمنٹری (دستوری) ہے، اگرچہ طرز حکومت بظاہر شخصی ہے یعنی ایک خاص خاندان شاہی وراثۃً فرماں روا ہوتا ہے لیکن حکومت کا نظم ونسق، پارلیمنٹ، ہوس آف لارڈس اور ہوس آف کامنز سے مرکب ہے، اسلئے یہ شخصیت دراصل اعلیٰ درجہ کی جمہوریت ہے، اس اصول کے تسلیم کرنیکے ساتھ کہ انگریزی گورنمنٹ دراصل پارلیمنٹری (دستوری) ہے پالیٹکس کا مسئلہ پیدا ہو جاتا ہے، یعنی یہ کہ رعایا کو انتظام حکومت میں ہر قسم کی مداخلت ہے، اظہار رائے اور نکتہ چینی کا حق حاصل ہے، بلکہ زیادہ صحیح یہ ہے کہ رعایا محکوم بھی ہے اور حاکم بھی، وہ خود اپنے لئے قانون بناتی ہے، اور خود اس پر عمل کرتی ہے،

انگلستان میں یہ مسئلہ بالکل صاف ہے، لبرل اور کنسرویٹیو، دونوں میں سے کوئی اس سے انکار نہیں کر سکتا لیکن ہندوستان میں آکر اس مسئلہ کا رخ بدل جاتا ہے، اور یہی وہی نقطہ ہے جہاں سے ہماری یعنی ہندوستانیوں کی پالیٹکس کا خط شروع ہوتا ہے،

اب سوال یہ ہے کہ کیا ایک عمدہ اصول حکومت، ایک پرفخر جمہوریت، ایک بے نظیر

قانون انصاف، صرف اس وجہ سے قالب بدل کر دفعۃً اپنی تمام خصوصیتیں کھو دیتا ہے کہ ملک اور رنگت بدل گئی ہے؟ کیا ہندوستان کی خاک نے حاکمانہ دماغ نہیں پیدا کیے ہیں؟ کیا اس وسیع سرزمین میں بڑے بڑے مدبرین ملک نہیں گذرے؟ کیا یہاں کے مقننوں نے بانیانِ قانون کی صف میں ممتاز درجہ نہیں حاصل کیا؟ کیا اسی ملک نے اکبر اعظم ٹوڈر مل، ابوالفضل، عضدالملک، اور سر سالار جنگ نہیں پیدا کیے؟ جو خاک ان جواہرات کو پہلے پیدا کر سکتی تھی، کیا انگریزی گورنمنٹ کے مبارک عہد میں اس شرف سے محروم ہو گئی ہے؟ قیاس اور استنباط کی ضرورت نہیں، واقعات اور تجربے کیا شہادت دے رہے ہیں؟ ہندوستانیوں میں سے جن لوگوں کو حکومت کی بلند ذمہ داریاں دی گئیں، ان میں سے کون امتحانِ مقابلہ میں ناکامیاب رہا؟ کیا اس سے انکار ہو سکتا ہے کہ سید محمود، بدرالدین طیب جی، مولوی امیر علی بہترین جج تھے،؟ کیا اس میں کسی کو شبہہ ہے کہ نوروزجی پارلیمنٹ کا کامیاب ممبر تھا، کیا گوکھلے کی صدائے شہرت لندن میں نہیں گونجی،؟ کیا سید علی امام اپنے ہمسروں کی صف میں علانیہ نمایاں نہیں ہے؟ لیکن چونکہ ایک مدعی کا دعوی گو کتنا ہی زبردست ہو آسانی سے تسلیم نہیں کیا جا سکتا، اس لئے ہمکو یہ دیکھنا ہے کہ سب سے بڑی معدلت گاہ نے اس مسئلہ کے متعلق کیا فیصلہ کیا ہے؟ غدر کے بعد جب عنانِ حکومت حضور ملکۂ معظمہ نے اپنے ہاتھ میں لی، تو پچھلے تجربہ کے نتیجہ کے طور پر یہ اعلان دیا کہ ہندوستان میں جو حکومت کیجائے گی اس میں رنگ اور قومیت کا امتیاز نہ ہوگا، یہ اعلان حضور ممدوحہ کی ذاتی رائے نہ تھی، بلکہ وہ پارلیمنٹ کی ملک کی انگریزی قوم کی باضابطہ آواز تھی،

ہم کو معلوم ہے کہ لارڈ کرزن اس اعلان کو دل خوش کن وعدہ سمجھتے تھے، لیکن لارڈ کرزن کو کیا حق حاصل ہے کہ وہ ایسے جائز، ایسے قابلِ فخر، ایسے پر انصاف، ارشاد شاہی

کی غلط تعبیر کرکے اسکی عظمت اور قیمت کو پامال کریں ؟

لیکن ان سب باتوں سے قطع نظر، دیکھنا یہ ہے کہ اس معرکہ میں فتح وشکست کا کیا فیصلہ ہوا، جس زمانہ میں اول اول ہندوستان کی طرف سے حقوق طلبی کا مقدمہ انصاف کی عدالت میں پیش ہوا، اس وقت سے آج تک برابر انگلو انڈین کی طرف سے پرزور مقاومت ہے لیکن نتیجہ یہ ہوا کہ روز بروز حریف کو شکست ہوتی گئی، وہ بڑے بڑے عہدے جو اُن کے لئے مخصوص، اور گویا زمین ممنوعہ تھے، ان سے خصوصیت کا پردہ اٹھ گیا، کلکتہ، بمبئی، الہ آباد، مدراس، پنجاب کے ہائی کورٹوں میں ہندوستانی انگریزوں کے ساتھ دوش بدوش بیٹھے آج ایوانِ گورنری کے چھ ستونوں میں سے ایک ستون اعظم ہندوستان ہی، اور سب سے بڑھکر یہ کہ رفارم اسکیم نے گویا سلف گورنمنٹ (زیر حمایت برطانیہ) کا سنگ بنیاد رکھدیا،

جو جد وجہد، جو سعی وعمل جو پرجوش کوششیں ملک میں جاری تھیں، ناممکن تھا کہ مسلمان ان سے بے اثر رہتے، بمبئی محض دوکان داروں کی منڈی ہے مسلمانوں میں وہاں نام کو تعلیم نہیں، جس زمانہ کا یہ ذکر ہے، اس وقت تک تمام بمبئی میں ایک گریجویٹ بھی نہیں پیدا ہوا تھا، اور آج بھی دو چار سے زیادہ نہیں، تاہم اس خاک نے بدرالدین طیب جی پیدا کیا، جو نیشنل کانگرس کی خطرناک پریسیڈنٹی قبول کرنے سے نہ جھجکا، اور جو سرکاری ملازمت یعنی ہائی کورٹ کی ججی کے زمانہ میں بھی اپنی آزاد خیالی کو دبا نہ سکتا تھا، اس تاجرانہ منڈی کا دوسرا ممبر رحمت اللہ سیانی تھا، اور اس نے بھی یہ منصب اعظم دلیرانہ حاصل کیا تھا، مدراس میں سید محمد اور کلکتہ میں مسٹر امیر علی پالٹیکس میں ہاتھ لگانے سے ڈرتے نہ تھے، ان واقعات سے ظاہر ہوتا ہے کہ ملک کا ذرہ ذرہ پالٹیکس کی روشنی سے چمکتا تھا، لیکن یہ نہایت تعجب انگیز بات ہے کہ ممالک مغربی وشمالی اور آگرہ و دہلی و پنجاب جو ایک زمانہ میں مرکز

حکومت اور ہندوستان کے جسم کا دل و دماغ رہ چکا تھا، جہاں مسلمان نسبتہً ہندوستان کے تمام حصوں کی بہ نسبت زیادہ تعلیم حاصل کر چکے تھے، جہاں عرب و عجم کے بہترین خاندانوں کی یادگاریں موجود تھیں، وہ پالیٹکس سے اس قدر بے حس رہا کہ آج بھی پالیٹکس کا نام لیتا ہے، تو زبان لڑکھڑاتی ہے، اس عجیب اور حیرت انگیز اختلافِ حالت کا سمجھنا آسان نہیں، یہ حالت قدرتی اور اصلی نہ تھی، بلکہ پرزور رکاوٹوں نے پیدا کی تھی، وہ پرزور دست و قلم جس نے "اسباب بغاوت ہند" لکھا تھا، اور اس وقت لکھا تھا جب کورٹ مارشل کے ہیبت ناک شعلے بلند تھے، وہ بہادر جس نے پنجاب یونیورسٹی کی مخالفت میں لارڈ لٹن کی اسپیچوں کی دھجیاں اڑا دی تھیں، اور جو کچھ اس نے ان تین آرٹکلوں میں لکھا، کانگریس کا لٹریچر حقوق طلبی کے متعلق اس سے زیادہ پرزور لٹریچر نہیں پیدا کر سکتا، وہ جاں باز جو آگرہ کے دربار سے اس لئے برہم ہو کر چلا آیا تھا کہ دربار میں ہندوستانیوں اور انگریزوں کی کرسیاں برابر درجہ پر نہ تھیں، وہ انصاف پرست جس نے بنگالیوں کی نسبت کہا تھا "میں اقرار کرتا ہوں کہ ہمارے ملک میں صرف بنگالی ایسی قوم ہیں جن پر ہم واجبی طور سے فخر کر سکتے ہیں، اور یہ صرف ان ہی کی بدولت ہے، کہ علم اور آزادی اور حبِ وطنی کو ہمارے ملک میں ترقی ہوئی ہیں صحیح طور پر کہہ سکتا ہوں کہ وہ بالیقین ہندوستان کی تمام قوموں کے سرتاج ہیں" (دیکھو تقریر پریسیڈنٹ مسلم لیگ بمقام ناگپور)

حالات اور گرد و پیش کے واقعات نے اس کو اس پر مجبور کیا کہ اس نے تمام اسلامی پبلک کو پالیٹکس سے روک دیا، یہ کیوں ہوا؟ کن اسباب سے ہوا؟ کس چیز نے یہ اختلافِ حالت پیدا کر دیا؟ ان سوالات کا جواب دینا آج غیر ضروری بلکہ مضر ہے،

آج اجتہاد اور تقلید سے آزادی کا زمانہ ہے، آج ہمکو کسی مسئلہ کو اس بنا پر ماننا یا انکار کرنا نہیں چاہئے، کہ کسی بڑے سے بڑے شخص کی رائے اس کے متعلق کیا ہو؟ بلکہ اس لئے

کہ فی نفسہ وہ مسئلہ کیا ہے؟ ہم (مسلمان) وہ لوگ ہیں کہ پیغمبر کے سوا کسی کو معصوم نہیں سمجھتے ہماری ایک بڑھیا نے فاروق اعظمؓ کو سر منبر ٹوک دیا تھا، کیا ہماری تمام عقل و سمجھ، دل و دماغ، تجربہ مشاہدہ، جذبات و احساسات سب اس لئے بیکار ہو جانے چاہئیں کہ کسی ریفارمر نے کسی زمانہ میں کہا تھا؟

تاہم ہمکو ایک دفعہ اس نامور لیڈر کے ارشادات کو اس نظر سے دیکھنا چاہئے کہ وہ ایک موقت شریعت تھی، یا اب ہماری پولیٹکل زندگی کا وہ ابدی قانون ہے، سرسید مرحوم کی مشہور پولیٹکل اسپیچ کا جس کی خود غرضانہ قدردانی کا ثبوت مسٹر بک نے اوس کو تار پر ولایت بھیجنے سے دیا تھا، سنگِ بنیاد یہ تھا "اگر کونسل کے ممبر انتخاب سے مقرر ہوں تو کسی طرح مسلمانوں کی تعداد ہندوؤں کے برابر نہیں ہوسکتی کیونکہ ہندوؤں کی تعداد ہندوستان میں بمقابلہ مسلمانوں کے چوگنی ہے پس جو طریقہ انتخاب کا قرار دیا جائیگا، اوس سے اگر ایک مسلمان ممبر ہوگا تو چار ہندو ہوں گے، اور اگر بفرض محال کوئی ایسا قاعدہ رکھا جائے جسکی رو سے ہندو اور مسلمان دونوں قوموں کے ممبر برابر رہیں، تو موجودہ حالت میں ایک مسلمان بھی ایسا نہ نکلے گا جو وائسرائے کی کونسل میں بمقابلہ ہندوؤں کے کام کرنے کے قابل ہو"

یہ خطرہ بالکل بجا تھا، اور اب بھی ہے لیکن بہرحال یہ تو وجود میں آچکا، ریفارم اسکیم نے یہ خطرناک قاعدہ جاری کر دیا، اور تمام مسلمان صرف اتنی ترمیم پر راضی ہو گئے، کہ مردم شماری کی نسبت سے ان کی تعداد زیادہ رہے، اور ان کے ممبروں کا انتخاب خود ان کے ہاتھ میں ہو، اس ترمیم کا اگرچہ اصل مسئلہ پر کچھ اثر نہیں پڑا مسلمان اب بھی مناریٹی میں ہیں، اور ہمیشہ رہینگے لیکن اس ترمیم کی کامیابی پر جو درحقیقت سرسید کی نافرمانی تھی، تمام ہندوستان کے مسلمانوں نے اس سرے سے اس سرے تک خوشی کے نعرے بلند کئے، نیشنل کانگریس کی شرکت

اگر اس لئے بڑی تھی کہ وہ انتخابی اصول چاہتی تھی اور مسلمان کسی طرح اس اصول کو تسلیم نہیں کر سکتے تھے، تو انتخابی اصول بہرحال آج وہ قبول کر چکے،

تقریر مذکورۂ بالا کا دوسرا ٹکڑا یعنی موجودہ حالت میں کوئی مسلمان والیسرائے کی کونسل میں ممبری کرنے کے قابل نہیں ہو، علی گڈھ اسکول کے لحاظ سے بالکل صحیح ہے، لیکن کیا بدرالدین طیب جی، مسٹر امیر علی، رحمت اللہ سیانی، اس زمانہ میں اس کام کے قابل نہ تھے؟ اور کیا آج سید علی امام، سید حسن امام، مظہر الحق، اپنے ہندو حریفوں سے کم ہیں، ہے شبہ ان میں سے کوئی شخص مجموعی حیثیتوں سے گوکھلے نہیں ہو لیکن خود ہندوؤں میں دوسرا گوکھلے کون ہے علی گڈھ نے سیکڑوں، ہزاروں اعلیٰ درجے کے دل و دماغ کی تربیت کی، ہزاروں گریجویٹ بنائے، "کامریڈ" کا اڈیٹر، سجاد حیدر جیسا انشاپرداز، اور ظفر علی خاں جیسا دلیر پیدا کیا جو ایسے قابل اشخاص پیدا کر سکتا تھا، کیا وہ بدرالدین طیب جی اور علی امام نہیں پیدا کر سکتا تھا، ہ لیکن جس عضو سے کام نہیں لیا جاتا وہ بیکار ہو جاتا ہو، اس لئے پولیٹکل تعلیم سے محروم رہنے کا یہ لازمی نتیجہ تھا، اور یہی ہونا چاہئے تھا، سرسید کے ارشادات کا ایک فقرہ یہ ہو:-

"اگر بالفرض کوئی ایسا مسلمان نکل بھی آئے، تو ہرگز یہ امید نہیں کہ وہ اپنے کاروبار چھوڑ کر سفر کی تکلیف گوارا کر کے تمام اخراجات، جو ایک ممبر کونسل کے لئے زیبا ہیں، اپنے پاس سے برداشت کر کے یا قوم سے چندہ کر کے کلکتہ اور شملہ میں حاضر رہے گا"۔

کاش سرسید آج زندہ ہوتے، اور دیکھتے کہ ایک مسلمان نہیں، بلکہ کئی، اور کئی سے بھی زیادہ کلکتہ اور شملہ کا سفر کرتے ہیں، اور ہفتوں وہاں موجود رہتے ہیں، اور ہر قسم کے مصارف برداشت کرتے ہیں مسلمان خدا کے فضل سے ایسے فیاض ہیں کہ والیسرائے کی کونسل کا تو کیا ذکر ہے بعض مجالس کے سالانہ جلسوں میں سینکڑوں، ہزاروں کوس کا سفر

کرکے آتے ہیں، اور چند باتیں کرکے چلے جاتے ہیں نیشنل کانگریس کی مخالفت کی سب سے بڑی وجہ سرسید نے یہ ظاہر کی تھی، کہ اگر مقابلہ کا امتحان، جو نیشنل کانگریس کے مطلوبات میں ہے ہندوستان میں جاری ہوا، تو کمینہ قوموں کو حکومت کی کرسیاں نصیب ہوں گی، اور ہندوستان کی شریف قومیں اپنے ملک کے ایک ادنیٰ درجہ کے شخص کا جس کی جڑ بنیاد سے واقف ہیں، کبھی اپنی جان اور مال پر حاکم ہونا پسند نہ کریں گے"

لیکن ہم نے اپنی آنکھوں سے دیکھا، کہ بڑھئی، جلاہے، رائیں گاڑیں، بڑے بڑے عہدوں پر پہنچے، اور بڑے بڑے تیس مارخانوں اور نسل تیمور اور آل ہاشم نے ان کے آگے گردنیں جھکا دیں،

سرسید نے اس تقریر میں یہ فرمایا تھا کہ بنگالی اس قدر بزدل ہیں کہ چھری کی صورت دیکھ کر، کرسی پر سے گر پڑتے ہیں، اور میز کے نیچے رینگنے لگتے ہیں، جب یہ فقرہ کہا گیا تھا بالکل سچ تھا، لیکن کیا آج بھی سچ ہے، ؟ جب زمانہ اس قدر دور نکل آیا ہے، جب تمام حالات بالکل بدل گئے ہیں، جب موجودہ زمانہ نے پرانا سین بالکل ڈراپ کر دیا، تو کیا وہ شمع جو رات کے وقت جلائی گئی تھی، روز روشن میں بھی رہنمائی کا کام دیگی؟

عورتوں کی تعلیم، ٹکنیکل تعلیم، سائنس کی تعلیم کے متعلق سرسید کو جو بے اعتنائی تھی، ان چیزوں میں ہم ان کی مخالفت کرکے گنہگار ہو چکے ہیں، ایک پالٹیکس کا گناہ اور سہی، ؎

ایں ہم اندر عاشقی بالائے غمہائے دگر

لیکن بحث کا اصل پہلو اب بھی نظر انداز رہ گیا ہے، سرسید نے نیشنل کانگریس سے رد کا تھا لیکن نیشنل کانگریس اور پالٹیکس مرادف الفاظ نہیں ہیں، پالٹیکس کے متعدد اسکول ہیں انگلستان میں لبرل ہیں کنسرویٹیو ہیں، ریڈیکل ہیں، اور یہ سب پولیٹکل فرقے ہیں نیشنل کانگریس پالٹیکس

کا ایک خاص اسکول ہی، ہم تسلیم کرتے ہیں کہ خاص اسکول ہمارے لئے مفید نہیں، سوال یہ ہے کہ ہم کو مطلقاً پالٹیکس میں پڑنا چاہیئے یا نہیں؟ یعنی ہمارے کچھ حقوق گورنمنٹ پر ہیں یا نہیں؟ انتظامِ حکومت میں ہم کو بھی مداخلت کا حق ہے یا نہیں؟ اور اگر ہے، تو ہم کو اس کا مطالبہ کرنا چاہیئے یا نہیں؟ سرسید نے مختلف موقعوں پر ملکی اور تعلیمی معاملات میں جس لہجہ میں حقوق کا مطالبہ، اور آزادانہ اظہارِ رائے کیا، کون اس سے زیادہ کرسکتا ہے؟ لارڈ لٹن نے جب پنجاب میں مشرقی یونیورسٹی قائم کی، تو سرسید کو خیال پیدا ہوا کہ اس سے انگریزی تعلیم کا گھٹانا مقصود ہے، اس وقت اُنھوں نے "تہذیب الاخلاق" (بار دوم) میں تین ایسے پرجوش آرٹیکل لکھے جن میں لارڈ لٹن کی اسکیم کی دھجیاں اڑا دیں، اس کے چند فقرے یہ ہیں:۔

"ہم نہایت سچائی اور گورنمنٹ کی خیرخواہی سے بتانا چاہتے ہیں کہ سمجھدار اور دور اندیش ہندوستانی ان تمام کارروائیوں سے گورنمنٹ کی نسبت کیا خیال رکھتے ہیں، نہایت بدخیال ان کے دل میں پیدا ہوتا ہے چند سال گذرے کہ ان کو یقین کامل تھا کہ گورنمنٹ کو درحقیقت ہمکو واقعی تعلیم دینا منظور نہیں ہے،...... وہ ہمکو ایسا مرکب بنانا چاہتی ہے کہ اسباب لاد کر ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچادے، اس کو انتظامِ ملک اور انتظامِ دفتر کے لئے چند ایسی پتلیاں درکار ہیں جو انگریزی لکھ سکتی ہوں۔"

"کچھ عرصہ نہیں گذرا کہ ہندوستانیوں میں سے یہ خیال دور ہوا تھا...... مگر ہندوستانی خوب سمجھتے ہیں کہ تھوڑے دنوں سے بعض مدبرینِ سلطنت کی پالیسی پھر بدل لی ہے اور ہندوستانیوں کو اب اعلیٰ درجہ کی تعلیم دینا مناسب نہیں سمجھتی۔"

"ہم پر احسان رکھکر ہمکو دھوکے میں پھرڈالا جاتا ہے، کہ ہم تمھارے مشرقی علوم اور تمھاری مشرقی زبان کو ترقی دیتے ہیں، مگر ہم پوچھتے ہیں کہ کیوں؟ اور کس مطلب سے؟

اس کا جواب کسی پیرایہ میں دیا جائے، اور کیسے ہی میٹھے لفظوں میں دیا جائے، اس کا نتیجہ یہی ہے کہ غلامی کی حالت میں رکھنے کے لئے۔"

"ہمارے لئے سیدھا ہاتھ کھلا ہوا ہے ...... جو فیض تعلیم و تربیت ہم نے ان مہذب ملکوں میں حاصل کیا ہے، اسکو اپنے ہم وطنوں اور ہم قوموں میں پھیلائیں۔"

"بیشک ایسا کرنے میں بہت مشکلات ہیں ...... ادھر اپنی فتح مند قوم کے ان تنگدل لوگوں کی مزاحمت کا برداشت کرنا ہے، جو ہماری سوشیل اور پولیٹکل حالت کی ترقی کو اپنی طبعی تنگدلی کے برخلاف سمجھتے ہیں ...... مگر ہمکو اپنی قوم کی بھلائی پر نظر رکھنی چاہئے، اور جو تکالیف اور مشکلات ہمکو پیش آئیں نہایت تحمل اور پختہ مزاجی سے برداشت کرنی چاہئیں،"

جب الہ آباد یونیورسٹی قائم ہو رہی تھی، اور سرسید کو کھٹکا ہوا کہ اس میں بھی مشرقی تعلیم کو وسعت دیجائے گی تو انھوں نے ایک آرٹیکل لکھا جس کے یہ الفاظ تھے،

"علوم مشرقی کی ترقی کا ڈھکوسلا دیکر انگلش ہائی ایجوکیشنل کو گھٹانا اور جس طرح ایک تیلی اپنے کولھو کے بیل کی آنکھیں بند کر کے دن رات ایک ہی سرکل میں پھرائے جاتا ہے، اسی طرح ہندوستانی رعایا کی آنکھیں بند کر کے دن رات ایک ہی چکر میں ڈالے رکھنا، بیشک ایک نامہذب گورنمنٹ کا کام ہے"

"ہم کو گورنمنٹ کی پالیسی کی کچھ پروا نہیں کرنی چاہئے، اور خود اپنے انگلش ہائی ایجوکیشن کے حاصل کرنے کی کوشش کرنی چاہئے، اور اگر ہم میں سلف ریسپکٹ کا کچھ بھی اثر باقی ہے، تو گورنمنٹ کو دکھا دینا چاہئے کہ بلا شبہہ گورنمنٹ کو لوگوں کی جانوں پر اختیار ہے، مگر لوگوں کی رایوں پر نہیں"

جو سیت ہمت آج سرسید کی پیروی کا دم بھرتے ہیں اور پالٹکس سے علیحدہ رہنے کے لئے سرسید کے مختص السحالات فقرات پیش کرتے ہیں، انھوں نے سرسید کے پولیٹکل شاہنامہ میں سے صرف "منیژہ منم"[1] یاد رکھا ہے

---

[1] فردوسی کے شاہنامہ کا مشہور شعر ہے، منیژہ منم دخت افراسیاب ؎ برہنہ ندیدہ تنم آفتاب،

بہر حال سر سید نے اگر نیشنل کانگرس سے روکا تو اچھا کیا، کانگرس میں شریک ہونا پھر بھی تقلید تھی جو ہمارا عار ہے، ہمکو خود اپنے پاؤں پر کھڑا ہونا چاہیئے، ہمکو اپنا راستہ آپ متعین کرنا چاہیئے ہماری ضروریات ہندؤں کے ساتھ مشترک بھی ہیں اور جداگانہ بھی، اس لئے ہمکو ایک جداگانہ پولیٹکل اسٹیج کی ضرورت ہے، اس موقع پر پہنچکر دفعۃً ہمارے سامنے ایک چیز نمودار ہوتی ہی "مسلم لیگ" یہ عجیب الخلقت کیا چیز ہے؟ کیا یہ پالٹیکس ہو؟ خدانخواستہ نہیں، اُلٹی کانگرس ہے؟ نہیں، کیا ہوس آف لارڈز ہے؟ ہاں سوانگ تو اسی قسم کا ہو،

(۴ر مارچ ۱۹۱۲ء)

(۳)

ہمارے پچھلے دو آرٹکلوں نے ہمارے دوستوں کو سخت برہم کر دیا ہی، ہمارا جرم، مفرد جرم نہیں، بلکہ سینکڑوں جرائم کا مجموعہ ہی، ہم نے مسلمانوں کی سنّی سالہ پالٹیکس کی بے احترامی کی، ہم نے مسلمانوں کی پولیٹکل پالیسی سے بغاوت کی، ہم نے اتفاق عام کے شیرازہ کو درہم کرنا چاہا، ہماری گستاخیوں سے ڈر ہے کہ لیڈروں کی عظمت وشان میں فرق آجائے، ہمارا لہجہ سخت ہے، ہم لیگ جیسے پرزور انسٹیٹیوشن کی عظمت کے منکر ہیں، ہم مصنف کے درجہ پر قانع نہ ہوکر پولیٹکل لیڈر بننا چاہتے ہیں، ہم کونسل کی ممبری کے امیدوار ہیں،

ایسے خطرناک جرائم کی تحقیقات کے لئے فوراً انکویزیشن کی عدالتیں نہ قائم کیجاتیں، تو معلوم نہیں قوم کا کیا حال ہو جاتا؟ اس لئے راولپنڈی اور فیض آباد یعنی مشرق ومغرب دونوں سروں پر قیصر او رچودھویں صدی کے حرم میں عدالتیں قائم ہو گئیں، اور پے در پے اجلاس ہوئے لیکن دونوں عدالتوں کے اصول میں کسی قدر فرق ہی، فیض آباد کی عدالت نے صرف ہم کو مجرم قرار دیا ہے، لیکن راولپنڈی کی عدالت گاہ کے کٹہرے میں ہمارے ساتھ چند اور مجرم نظر آتے

ہیں، ان میں چند نوجوان (کامریڈ و زمیندار) ہیں جن کی مصیبت کا ہمکو غم نہیں، وہ جوان جہان ہیں، ان کڑیوں کو جھیل لیں گے لیکن اسی حلقہ میں ایک ہفتاد سالہ بڈھا (وقارالملک) بھی ہے جو سرسید مرحوم کا صحبت یافتہ، اور قومی تعلیم گاہ کی خدمت کرتے کرتے اس کی کمر خم ہو گئی ہے، اس پر صریح اور صاف بغاوت کا الزام ہے، وہ عدالت کے سامنے زبانِ حال سے کہہ رہا ہے، مصرع

غازی چو تو ئی رواست کافر بودن

سب سے پہلے یہ دیکھنا ہے کہ اگر ہماری موجودہ پالٹکس کوئی اصلی پالٹکس ہے، تو باوجود اس کے کہ اسکو تیس برس کی قدامت کا حق حاصل ہے، باوجود اس کے کہ اس کے صدر نشین اور وزرا تمام ہندوستان کے انتخاب اور دولت و عزت کے دیوتا ہیں، باوجود اس کے کہ اس کے آرگنائزیشن کا وسیع سلسلہ تمام ہندوستان میں پھیلا ہوا ہے، باوجود اس کے کہ تمام اسلامی جماعتیں اس کے حلقہ میں بندھ چکی ہیں، باوجود اس کے کہ مسلمان گورنمنٹ سے جو کچھ کہتے ہیں اسی کی زبان سے کہتے ہیں، باوجود اس کے کہ سپرٹ الیکشن جیسے معرکہ میں وہ فتح کامل حاصل کر چکی ہے، باوجود ان تمام باتوں کے ذرا سی ہوا بدلنے سے دفعۃً تیس برس کا بنا بنایا کھیل بگڑ جاتا ہے، ایک پرزور عمارت ایک خفیف صدمے سے متزلزل ہو جاتی ہے، ایک عالمگیر اور پرزور پالسی میں دفعۃً ہر جگہ سرکشی کے آثار پیدا ہو جاتے ہیں،

جو شخص دو برس تک مسلم لیگ کا سکریٹری رہ چکا ہے، وہ خود اس کی بے اعتباری کا مرثیہ پڑھتا ہے، قومی اخبارات کا لہجہ بدل جاتا ہے، لیگ کا صیغۂ راز ایجی ٹیشن کی تلقین پر آمادہ ہوتا ہے، پالٹکس کا مرکزِ ثقل یعنی ملکی مطالبات میں ہندوؤں سے الگ رہنا، اصل جگہ سے ہٹ جاتا ہے، ولایت کی مسلم لیگ یہ تجویز پیش کرتی ہے کہ اب دونوں ڈانڈے قریب تر آجائیں اور ایک مشترکہ پلیٹ فارم قائم ہو،

ہم پر اکثر یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ ہم لیگ پر اعتراض کرتے ہیں، لیکن خود نہیں بتاتے کہ صحیح پالیٹکس کیا ہے،

اگرچہ ہم آگے چل کر صحیح پالیٹکس بتائیں گے لیکن سچ یہ ہے کہ صرف یہ سمجھ لینا کہ موجودہ پالیٹکس غلط ہے، یہی صحیح پالیٹکس ہے، غلط پالیٹکس کے جراثیم قوم کے دل و دماغ میں سرایت کر گئے ہیں، اور یہی جراثیم صحیح پالیٹکس کی طرف متوجہ ہونے نہیں دیتے، اگر سرے سے پالیٹکس کی مخالفت کیجاتی، تو آسان تھا کہ صحت کی حقیقت سمجھا دیجاتی لیکن آپ سب کچھ تسلیم کر کے کہہ دیتے ہیں کہ ابھی اس کا وقت نہیں آیا ہی، ابھی صرف تعلیم کی ضرورت ہے، یہ ایک مختصر سا جملہ مسئلہ کی تمام اہمیت اور جذبات کے تمام جوش کو دفعۃً برباد کر دیتا ہے، اور آپ وہیں پہونچ جاتے ہیں، جہاں تیس برس پہلے تھے،

سب سے بڑھکر خطرناک یہ غلطی ہے کہ ایک فرضی بیکار چیز (مسلم لیگ) پیش کیجاتی ہے اور ظاہر کیا جاتا ہے کہ یہ پالیٹکس ہے، قوم جو تیس برس کی افسوں گری سے معمول ہو چکی ہے عامل جو کہتا ہے، اس کو ویسا ہی نظر آتا ہی، اس لئے آج ہزاروں اچھے پڑھے لکھے اس سراب کو چشمۂ زندگی سمجھ رہے ہیں،

یونان میں ایک مصور تھا، اُس نے مصوری کی تعلیم کی فیس دس روپیہ مقرر کی تھی لیکن جو شخص کسی اور مصور سے کچھ اور سیکھ کر آتا تھا، اس سے دوگنی فیس لیتا تھا، لوگوں نے سبب پوچھا اس نے کہا کہ دس روپیہ اس بات کے لیتا ہوں کہ جو کچھ پہلے سیکھ کر آیا ہے، اس کو اس کے دل سے مٹاؤں ورنہ یہ پچھلی غلط تعلیم کا اثر باقی رہجاتا ہی، اس بنا پر پالیٹکس کی بحث میں سب سے بڑا اور مقدم کام یہ ہے کہ یہ سمجھا دیا جائے کہ مسلم لیگ نہ آج بلکہ ہزار برس کے بعد بھی پالیٹکس نہیں بن سکتی، مسلم لیگ کیونکر قائم ہوئی؟ کب قائم ہوئی؟ کس نے قائم کی؟ اور سب سے بڑھکر یہ کہ یہ جی (بقول سرسید مرحوم)

خود دل سے اٹھی تھی، یا کوئی فرشتہ اوپر سے لایا تھا؟ یہ سوالات اگرچہ اصل مسئلہ پر کسی قدر اثر رکھتے ہیں، اور اگرچہ ان کے جواب دینے کا حق ہم کو اسی قدر حاصل ہے جس قدر خود بانی اوّل کو، (کیونکہ جب یہ تماشا ہو رہا تھا تو ہم کو پردہ کی طرف جھانکنے کی اجازت تھی) تاہم اس سے ضروری تر باتیں در پیش ہیں، اور ہم کو پہلے ان کی طرف متوجہ ہونا چاہئے،

امور تنقیح طلب حسب ذیل ہیں،

(۱) کیا لیگ کا کانسٹیٹیوشن پالٹیکس سے مطابقت رکھتا ہے؟

(۲) کیا اس میں پالٹیکس کی علامات پائی جاتی ہیں؟

(۳) کیا مسلم لیگ رہ کر کسی کام کے قابل ہو سکتی ہے؟

لیگ کا سنگ بنیاد شملہ کا ڈیپوٹیشن تھا، اور اب یا آئندہ جو کچھ اس کا ترکیبی نظام قرار پائے ڈیپوٹیشن کی روح اس میں موجود رہے گی، ڈیپوٹیشن کا مقصد سراپا یہ تھا، اور یہی ظاہر بھی کیا گیا تھا کہ جو ملکی حقوق ہندوؤں نے (اپنی سی سالہ جد و جہد سے) حاصل کئے ہیں، اس میں مسلمانوں کا حصہ متعین کر دیا جائے،

آج مسلم لیگ گو شرم مٹانے کے لئے کبھی کبھی عام ملکی مقاصد میں سے بھی کسی چیز کو اپنی کارروائی میں داخل کر لیتی ہے، لیکن ہر شخص جانتا ہے کہ یہ اس کے چہرہ کا مستعار غازہ ہے، رات دن جو شور مچایا جاتا ہے، روزمرہ جس عقیدہ کی تعلیم دی جاتی ہے، جو جذبہ ہمیشہ اُبھارا جاتا ہے وہ صرف یہ ہے کہ ہندو ہمکو دبائے لیتے ہیں، اس لئے ہم کو اپنا تحفظ کرنا چاہئے، مسلم لیگ کا اصل عنصر صرف یہ ہے، باقی جو کچھ ہے، موقع اور محل کے لحاظ سے تصویر میں کوئی خاص رنگ بھر دیا جاتا ہے

ہم شملہ ڈیپوٹیشن کی عظمت اور اہمیت کے منکر نہیں، وہ سب سے بڑا تماشا تھا، جو قومی اسٹیج پر کیا گیا لیکن گفتگو یہ ہے کہ رعایا میں سے دو قوموں کی باہمی نزاع اور چارہ جوئی کا نام پالٹیکس ہے؟ اگر یہ ہے

توسرکاری عدالتوں میں ہر روز جو کچھ ہوتا ہے سب پالٹیکس ہی، اور ہائی کورٹ کو ہائی کورٹ نہیں بلکہ سیاست گاہِ اعظم کہنا زیادہ موزوں ہوگا،

جیسا کہ ہم اس مضمون کے پہلے حصہ میں لکھ آئے ہیں، پالٹیکس کا خط وہاں سے شروع ہوتا ہی جہاں سے یہ بحث پیدا ہوتی ہو کہ انتظام حکومت میں رعایا کی شرکت کس حد تک ہونی چاہیے، یعنی پالیٹکس گورنمنٹ اور رعایا کے باہمی مطالبہ جات کا نام ہے، نہ رعایا کے باہمی منازعات اور حقوق طلبی کا،

اب کانگریس اور مسلم لیگ کے ریزولیوشنوں کا باہم موازنہ کرو، کانگرس نے ۱۸۸۵ء سے ۱۹۱۰ء تک جو ریزولیوشن پاس کئے ان میں سے بعض یہ ہیں:-

(۱) گورنمنٹ کی کارروائیوں پر ایک شاہی کمیٹی جس میں ہندوستانی ڈیلیگیٹ کافی مقرر ہوں،

(۲) انڈیا کونسل کی منسوخی،

(۳) سول سروس کا امتحان ہندوستان میں بھی قائم ہو،

(۴) لیجسلیٹو کونسلوں کی وسعت و اصلاح،

(۵) فوجی اخراجات کی کمی،

(۶) افلاسِ ہندوستان کی تدبیر، اور ہندوستانی ڈیلیگیٹ کی شرکت،

(۷) مجرمان زیر وارنٹ سشن میں انتقالِ مقدمہ کرا سکیں،

(۸) جوڈیشل اور ایگزکٹو اختیارات کی تفریق،

(۹) ہندوستانی والنٹیر بنائے جائیں،

(۱۰) صنعتی تعلیم کا انتظام،

(۱۱) بندوبست استمراری،

(۱۲) پولیس کی اصلاح،

(۱۳) محکمۂ آبکاری کی وسعت کی روک،

(۱۴) مقدمات کا فیصلہ بذریعہ جیوری،

(۱۵) تعلیمی اخراجات کا اضافہ،

یہ وہ مطالبات ہیں کہ اگر پورے کر دیئے جائیں تو ہندوستان کی قسمت بدل جائے اس کے مقابلہ میں لیگ کے مطالبات ملاحظہ ہوں،

(۱) سرکاری ملازمتوں میں مسلمانوں کو زیادہ حصہ ملنا چاہئے،

(۲) مسلمانوں کی نیابت کے اصول کو میونسپلٹی اور بورڈ میں بھی وسعت دیجائے،

(۳) لیگ ان کوششوں کی نسبت افسوس ظاہر کرتی ہے، جو اردو کے نقصان پہنچانے کے متعلق کیجا رہی ہیں،

(۴) ٹرانسوال میں ہندوستانیوں کے حقوق کا لحاظ کیا جائے،

(۵) اسلامی اوقاف کی تحقیقات کیجائے،

(۶) وقف علی الاولاد کے مسئلہ کو تسلیم کیا جائے،

یہ اعلیٰ ترین اور اہم ترین مطالبات ہیں جو لیگ نے پیش کئے ہیں، دونوں فریقوں کے مطالبات کی عظمت اور اہمیت اور دائرۂ اثر میں جو فرق ہے تم خود سمجھ سکتے ہو، شاید کہا جائے کہ بچوں کی طرح دور از کار بالا خوانی اور طمع خام کون سی رشک کے قابل چیز ہے، لیکن جب سے کانگریس نے ملکی مطالبات کا دیباچہ شروع کیا، اس وقت سے آج تک کے انتظامی تغیرات کا اگر مطالعہ کیا جائے تو صاف نظر آئے گا کہ سلف گورنمنٹ (زیر گورنمنٹ انگریزی) کا قدم برابر آگے بڑھتا جاتا ہے، لیکن تھوڑی دیر کے لئے اس سوال سے قطع نظر کر کے دونوں کے منتہائے خیال میں بلندی

دستی، وسعت اور تنگی کا کیا فرق ہے؟ یہ دیکھنا چاہئے کہ لیگ جو کچھ چاہتی ہی کس طریقہ سے چاہتی ہے؟ لیگ گورنمنٹ سے درخواست کرتی ہی کہ اوقاف بیجا طریقہ سے صرف ہو رہے ہیں، انکی نگرانی کی تدبیر اختیار کیجائے، گورنمنٹ جواب دیتی ہو کہ ثابت کرو کہ اوقاف کا انتظام بُرا ہی اور یہ کہ اور مسلمان بھی نگرانی کے خواہش مند ہیں، اس جواب پر دو برس گذر جاتے ہیں، اور لیگ خوابِ غفلت کی انگڑائیاں لیتی ہی، گورنمنٹ کا یہ حسنِ طلب تھا، اس کے جواب میں لیگ کو یہ کرنا تھا کہ ایک موریل تیار کرتی، تمام ہندوستان کے مسلمانوں سے اس پر دستخط کرائے جاتے، ہر صوبہ کی مقتدر انجمنیں عرضداشتیں بھیجتیں، تمام اخبارات ہم آہنگی کی صدائیں بلند کرتے، اسکے ساتھ واقعات اور اعداد سے اکثر اوقاف کی بد انتظامی ثابت کر دی جاتی،

جس گروہ کے نزدیک، صرف زبان سے کوئی لفظ بول دینا، پالٹکس ہے، وہ کیونکر پالٹکس کی حقیقت سمجھ سکتا ہے، پالٹکس ایک سخت قومی احساس ہی، اس کا ظہور بیگار کے طریقہ پر نہیں ہوتا، یہ احساس جب دل میں پیدا ہوتا ہی، تو دل و دماغ اور اعضا سب مصروفِ کار ہو جاتے ہیں، اور خود بخود جد و جہد، محنت و سعی، تگ و دو، ایثار و محویت کے جذبات پیدا ہو جاتے ہیں، لیگ کا طرزِ عمل بتاتا ہی کہ اسکی آواز ایک مصنوعی اور خارجی آواز ہے، لیگ اس پر اصرار کرتی ہے کہ سپرٹ الیکشن کا اصول میونسپلٹیوں میں جاری کیا جائے، لیکن سوال یہ ہے کہ جہاں یہ اصول جاری کر دیا گیا، (وائسرائے کی کونسل، اور صوبجات کی کونسل) وہاں اس سے کیا کام لیا گیا؟ کونسلوں میں ہمارے قائم مقاموں نے کس قسم کے سوالات کئے؟ کیا کیا اصلاحی تدبیریں پیش کیں؟ جن مسئلوں پر گفتگو کی، وہ بازاری گفتگو تھی، یا کسی ماہر فن کی؟ ہندو ممبر تمام ضروری رکارڈوں کا مطالعہ کرتا ہے، اعداد بہم پہنچاتا ہی، اور کوئی اہم، دقیق اور نتیجہ خیز سوال کرتا ہے، جو عام آدمیوں کے دائرۂ معلومات سے بالاتر ہوتا ہے، اس کے مقابلہ میں

ہمارا پولیٹکل قائم مقام کونسل میں نہایت زور شور سے الزام دینے کے لہجہ میں سوال کرتا ہے کہ گورنمنٹ کو معلوم ہے یا نہیں، کہ فلاں مختار خانہ میں وکلا کے بیٹھنے کے لئے کرسیوں اور مونڈھوں کا انتظام ہے یا نہیں ؟

پالیٹکس دنیا کا سب سے بڑا جذبہ ہے، وہ مذہب کے برابر طاقت رکھتا ہے، وہ انسان کے تمام جذبات کو زندہ کرتا ہے، اس سے تمام قوتیں مشتعل ہوجاتی ہیں، وہ انسان میں ہر قسم کا ایثار اور خود فروشی پیدا کر دیتا ہے، کیا ہماری موجودہ پالیٹکس نے یہ اوصاف ایک شخص میں بھی پیدا کئے ہیں، ؟ کیا پالیٹکس کے دائرہ میں آنے والا شخص ایک ذرہ بھی اس بات کو محسوس کرتا ہے کہ وہ کسی قسم کے نقصان کے لئے تیار ہے ؟ کیا وہ اپنے آپ میں کوئی عزم اور دلیری پاتا ہے ؟ کیا ہمارے پولیٹکل تماشا گروں میں ایک شخص بھی تیار رہوا، جو سرونٹ آف انڈیا سوسائٹی (جس میں اس وقت تیس شخص موجود ہیں) کی طرح اپنی تمام زندگی، باوجود گریجویٹ ہونے کے تیس روپیہ ماہوار پر قوم کے لئے نذر کر دے ؟ کیا گروکل (جس میں تین سو شخص تعلیم پا رہے ہیں) کی کوئی مثال ہم نے پیدا کی ہو، ؟ جناب ویسرائے کے حضور میں ڈیپوٹیشن کے ممبر بننے کے لئے تمام ملک نے اپنی خدمتیں پیش کی تھیں، لیکن ذرا سوال کو بدل دو یعنی ڈیپوٹیشن کو وسیرائے کی خدمت میں نہیں، بلکہ کسی ادنی معمولی درجہ کے حاکم کے پاس جانا ہوتا، تو گو مقصد کتنا ہی اہم ہوتا، تاہم ممبروں کی تعداد کس حد تک رہ جاتی، ؟ اس سوال کو ذرا اور ترقی دو یعنی فرض کرو کہ ڈیپوٹیشن کے جانے سے یہ احتمال ہوتا کہ کسی شگفتہ اور روشن پیشانی پر شکن پڑ جائے، تو تعداد کا دفعۃً کس درجہ تک نیچے اتر آتا ؟ حقیقت یہ ہے کہ ان لوگوں کا نفس خود ان کو دھوکا دے رہا ہے، یہ سمجھتے ہیں کہ سال میں دور دراز سفر اختیار کر کے پالیٹکس کے میلے میں جانا بھی ایثار نفس ہے لیکن کیا سال بھر میں ایک مشغلہ تفریح، نمود و نمائش کا اسٹیج، جاہ نمائی کا ایک تماشا گاہ، ایثار نفس ہو سکتا ہے ؟

درخت پھل سے پہچانا جاتا ہی اگر ہماری پالیٹکس درصل پالیٹکس ہوتی، تو جد وجہد اور ایثار وخود فروشی کے جذبات خود بخود ساتھ پیدا ہوتے،

اکثر یہ کہا جاتا ہے، اور گمراہی کا یہ ایک بڑا افسوس ہی، کہ ہندوؤں میں پچاس برس کے امتداد نے یہ خاصیتیں پیدا کی ہیں، دو چار برس میں ایسے نتائج کی توقع کیونکر کیجا سکتی ہے، لیکن واقعہ یہ ہے کہ جب پہلی اینٹ ٹیڑھی رکھی جاتی ہی تو، ع "تا ثریا می رود دیوار کج"،

ایثار نفس، پالیٹکس پر ختم نہیں، اس کے اور بھی سینکڑوں مظاہر ہیں، دوسرے شعبوں میں ایثار کا کون سا منظر نظر آیا؟ یونیورسٹی کو پالیٹکس سے کوئی تعلق نہیں، یونیورسٹی کے فیلو مسلمان بھی ہیں اور ہندو بھی ہم نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا ہی کہ ہندو ممبر جب یونیورسٹی کے اجلاس میں جاتا ہی تو مسائل زیر بحث پر تیار ہو کر جاتا ہی، تمام رکارڈوں کو ساتھ رکھتا ہی، لوگوں کو پہلے سے اپنا ہم رائے بناتا ہے، بخلاف اس کے ہماری تعلیم گاہوں کے تربیت یافتہ جلسہ میں جا کر یہ بھی خبر نہیں رکھتے، کہ ان کے سامنے کیا ہونے والا ہی،

امتداد اور درازی زمانہ کو کوئی دخل نہیں، طریق عمل اگر ٹھیک ہو تو پہلے ہی دن سے نتائج کے آثار ٹھیک نظر آنے لگتے ہیں تعلیم میں آج جہاں ہم ہیں، ہندو آج سے ساٹھ ستر برس پہلے وہیں تھے لیکن ہندوؤں نے اس زمانہ میں، راجہ رام موہن رائے اور کیشب چندر سین پیدا کر دیئے، اور ہم آج سو برس کے بعد بھی اس قسم کی مثالوں کی توقع نہیں کر سکتے بمبئی کے مسلمانوں میں کچھ بھی تعلیم نہیں تاہم وہاں بدرالدین طیب جی پیدا ہوتا ہے جو کانگرس کا پریسیڈنٹ ہو سکتا ہی،

ممالک متحدہ ہماری تعلیم کا مرکز ہے، اور ہزاروں گریجویٹ تیار کر چکا ہی لیکن "جی حضور" کے سوا وہ کیا چیز پیدا کر سکا ہی؟ اس سے معلوم ہوگا کہ امتداد زمانہ اور وسعت تعلیم اصل چیز نہیں

بلکہ طریق عمل اور تخیل کا فرق ہی،

سب سے آخری بحث یہ ہے کہ مسلم لیگ کا نظام ترکیبی کیا ہو؟ اور کیا وہ قیامت تک درست ہو سکتا ہو؟ پہلا سوال یہ ہے کہ کیا مسلم لیگ اس خصوصیت کو چھوڑ دیگی، کہ اس کو سب سے پہلے دولت اور جاہ کی تلاش ہی، اس کو اپنے صدر انجمن کے لئے، نیابت صدر کے لئے، سکریٹری شپ کے لئے، ارکان کے لئے، اضلاع کے عہدہ داران کے لئے، وہ مہرے مطلوب ہیں، جن پر طلائی رنگ ہو؟ لیکن پولیٹکل بساط میں ان مہروں کی کیا قدر ہی؟ کیا ایک معزز رئیس، ایک بڑا زمیندار، ایک حکام رس دولت مند کسی تحریک کے لئے اپنی جائداد، اپنی حکام رسی، اپنی فرضی آبرو کو نقصان پہنچانا گوارا کر سکتا ہو؟ ہندوؤں کے پاس زمینداری دولت اور خطاب کی کمی نہیں، لیکن کیا اُنھوں نے تیس برس کی وسیع مدت میں کسی بڑے زمیندار اور تعلقہ دار کو پریسیڈنسی کا کرسی نشین کیا، ہ کیا اس کے پریسیڈنٹوں میں کسی کا سر، خطاب کے تاج سے آراستہ ہے؟ لیکن ہم سب سے پہلے اجلاس میں پریسیڈنسی کے لئے ایک ایسے شخص کو تلاش کر کے بہم پہنچاتے ہیں، جس نے پالٹیکس کا لفظ تمام عمر نہیں سنا تھا، انگریزی، عربی، فارسی، اُردو، کوئی زبان نہیں جانتا تھا، اور عین اجلاس کے وقت جب اس کی طرف سے ایک شخص اس کی پریسیڈنشل اسپیچ پڑھ رہا تھا تو وہ بیچارہ حیران تھا، کہ یہ کون سی بولی بول رہا ہی،

آج کل کسی شخص کی پرائیویٹ حالت پوچھنا خلاف تہذیب ہی لیکن بہ ضرورت مسلم لیگ سے اگر یہ سوال کیا جائے، کہ مالی حالت کے لحاظ سے آپ کی ہستی کیا ہو؟ تو جواب ملے گا کہ ایک خاص "دست کرم" اس بنا پر مسلم لیگ کے تمام منصوبے، تمام تجویزات، تمام ارادے اس "دستِ کرم" کے اشاروں پر حرکت کرتے ہیں،

مسلم لیگ کے نظام ترکیب کی سخت غلطی، اس کی شاخوں کا وجود ہے، یہ ظاہر ہے کہ

تمام ملک میں ایسے مسلمان جو پالیٹکس کو صحیح طور سے سمجھ سکتے ہوں، اور کوئی آزادانہ کام کر سکتے ہوں
کس قدر کم ہیں، یعنی اگر ان کو پھیلایا جائے، تو ہر صوبہ کے حصہ میں بہ مشکل ایک آدمی آئیگا، اب جب
ہر شہر میں ایک شاخ قائم کیجاتی ہے تو عہدہ داروں اور ممبروں کی تلاش ہوتی ہے، اور چونکہ
لائق اشخاص نہیں مل سکتے، اس لئے جو شخص کچھ دولت مند مل جاتا ہی، اس کے سر پر یہ پگڑی رکھ
دیجاتی ہے، نتیجہ یہ ہوتا ہی کہ پالیٹکس کا ایک نہایت برا نمونہ بازیچۂ اطفال تیار ہوتا ہے، قوم کے سامنے
برا نمونہ سب سے بدتر چیز ہے، جب لوگ دیکھتے ہیں کہ اس کا نام پالیٹکس ہی، تو اُن کی پرواز ہمت
وہیں تک پہنچکر رہ جاتی ہے،

یہ سچ ہے کہ بعض اوقات کسی مسئلہ پر گورنمنٹ کی خدمت میں متفقہ آواز پہنچانے کے لئے
اس میں آسانی ہوتی ہے، کہ تمام شاخوں کو حکم بھیجدیا جاتا ہی لیکن اس کے لئے یہ کافی ہی کہ ہر شہر
کی ایک فہرست مہیا رہے، اور عند الضرورت اس سے یہ کام لے لیا جائے،

صحیح پالیٹکس، صحیح پالیٹکس کو اب مختصر لفظوں میں ادا کرنے کا وقت آگیا ہی، اور وہ یہ ہیں،

(۱) سب سے پہلا اور مقدم کام یہ ہے کہ مسلم لیگ اپنے مقاصد کے دائرہ کو وسعت دے
چھوٹی چھوٹی باتیں جو کسی خاص فرقہ سے تعلق رکھتی ہیں، ان کے علاوہ ان چیزوں کو اپنا
نصب العین قرار دے، جن پر ہندوستان کی قسمت کا فیصلہ موقوف ہی، مثلاً ایک بندوبست
کا مسئلہ، جس کو لیگ نے کبھی خیال کے ہاتھ سے بھی نہیں چھوا، یہ وہ مسئلہ ہے جس پر ہندوستان
کی سرسبزی کا مدار ہے، ہر شخص اپنی آنکھوں سے دیکھتا ہے کہ کاشتکار روز بروز مفلس ہوتے
جاتے ہیں، ہر بندوبست مالگذاری کی مقدار میں اس قدر اضافہ کر دیتا ہی کہ جو زمینیں مویشی
کا حق تھیں، ان کو اپنے کام میں لانا پڑتا ہے چارہ نایاب ہوتا جاتا ہے چراگاہیں مزروعہ بنتی
جاتی ہیں، ایک فصل بھی اگر کمی کر جائے تو فاقہ کی نوبت پہنچ جاتی ہے، ہزاروں کاشتکار

گھر چھوڑ چھوڑ کر نئی آبادیوں میں بھاگتے جاتے ہیں، مالگذاری کے وقت ہزاروں، لاکھوں کے زیورات رہن ہو کر بیدرد مہاجنوں کے گھر پہنچ جاتے ہیں، باایں‌ہمہ ہر تیسویں سال نیا بندوبست ہوتا ہے، اور زمیندار نئے بندوبست کے نام سے دہل جاتا ہے،

فرض کرو! اگر بنگال کی طرح ہمارے ملک میں بھی استمراری بندوبست ہوجائے، تو یہ ہندوستان کے حق میں رحمت ہوگا، یا یہ کہ چند مسلمانوں کو موجودہ تعداد سے زیادہ نوکریاں مل جائیں

(۲) سب سے بڑی بات یہ ہے کہ تمام انتظامی کاموں میں یہ خواہش کیجائے کہ ہندوستانیوں کی شرکت ہو، گوکھلے نے یہ بل پیش کیا تھا کہ ہر ضلع میں ایک کونسل چھ آدمیوں کی قائم ہو، اور کلکٹر ضلع ان کے مشورہ سے انتظامی امور عمل میں لائے، کون اس سے انکار کرسکتا ہے کہ اپنا حال ہم دوسروں سے زیادہ جان سکتے ہیں، کس کو اس سے انکار ہوسکتا ہے کہ اپنی تکلیف کا جس قدر احساس ہم کو ہوسکتا ہے، دوسرے کو نہیں ہوسکتا؟ اس لئے یہ سب سے عمدہ تدبیر تھی، جو ملک کی بہبودی کے لئے پیش کیجاسکتی تھی، لیکن یہ بل نامنظور کردیا گیا،

مختصر یہ کہ بجز کسی خاص ریزولیوشن کے باقی تمام ان تجاویز کو جو کانگرس میں پیش کیجاتی ہیں مسلم لیگ کو اپنے پروگرام میں داخل کرنا چاہئے، اور اسکی منظوری کے لئے اس طرح قانونی جدوجہد کرنا چاہئے جس طرح ہندوؤں کا ماڈریٹ فرقہ کرتا ہے،

(۳) مولوی امیر علی صاحب نے حال میں جو صورت تجویز کی ہے یعنی یہ کہ مشترکہ مسائل میں مسلمانوں اور ہندوؤں کا ایک مشترک اسٹیج قائم ہو، اور جب حضور وایسرائے کی خدمت میں ڈیپوٹیشن جائے تو دونوں گروہ کے ممبر برابر کے شریک ہوں، یہ نہایت صحیح تجویز ہے، اور اسکو فوراً اختیار کرنا چاہئے،

(۴) مسلم لیگ کی انتظامی کمیٹی بڑے بڑے زمینداروں اور علاقہ داروں سے بالکل

خالی کرلی جائے، صرف وہ لوگ شریک کئے جائیں، جو آزادی اور حق گوئی کے ساتھ اظہار رائے کرسکیں،

(۵) سب سے بڑی اور سب سے مقدم ضرورت یہ ہے کہ قوم میں پالٹکس کا مذاق پیدا کیا جائے پالیٹکس ایک وسیع علم ہے، اس کے مسائل اور معلومات کا ایک عظیم الشان ذخیرہ ہے، ان کو بقدر ضرورت اپنی زبان میں لایا جائے، مہمات مسائل پر رسالے اور پمفلیٹ شائع کئے جائیں کچھ لوگ مقرر کئے جائیں جو ملک میں دورہ کریں، اور پولیٹکل مسائل پر عالمانہ لکچر دیں، جو دلائل اور معلومات اور اعداد پر مبنی ہوں،

(۶) چند لوگ آنریری یا تنخواہدار مقرر کئے جائیں جو کسی خاص مسئلہ کے متعلق معلومات بہم پہنچائیں، مثلاً کسی ایک ضلع کے صدر مقام میں قیام کرکے ان امور کی تحقیقات کریں کہ تیس برس پہلے ضلع کی کیا حالت تھی؟ کتنے بڑے بڑے زمیندار تھے؟ کن لوگوں کے پاس زمینداریاں تھیں؟ اب کیا حالت ہے؟ کتنی زمینداریاں نیلام ہوگئیں؟ کس قسم کے قرضوں میں نیلام ہوئیں؟ بندوبست کا کیا اثر پڑا؟ کاشتکاروں کی کیا حالت ہے؟ کتنے آدمی دوسرے ممالک میں چلے گئے،؟ اس قسم کے اعداد اور واقعات سے پر نتائج یادداشتیں تیار ہوسکیں گی، اور گورنمنٹ ان سے فائدہ اٹھاسکے گی،

(۴)

ہندو مسلمانوں کا اتحاد مسائل پالیٹکس کا یہ ایک اہم مسئلہ قرار دیدیا گیا ہے یعنی چونکہ ان دو قوموں میں اتحاد ناممکن ہے، اس لئے پولیٹکل معاملات میں ہمارا اور ہندوؤں کا کوئی اسٹیج نہیں بن سکتا،

اس دلیل کے اگرچہ دونوں ٹکڑے غلط ہیں، لیکن اس فتنہ کو جس قدر کوئی بھڑکانا چاہے بھڑکا سکتا ہے، اولاً فطرت انسانی جس قدر اختلاف کے لئے موزوں ہے، اتفاق کے لئے نہیں ہے یہی وجہ ہے کہ اختلاف کی حالت میں جس طرح تمام جذبات مشتعل ہوجاتے ہیں، اتفاق کی حالت

ہیں نہیں ہو سکتے، دوسرے مسلمانوں کی آب و گل میں رزم جوئی ہے، یہ وصف عیب ہو یا ہنر، لیکن بہر حال یہ ہمارا اصلی جوہر ہے، جو ہمیشہ مختلف صورتوں میں ظاہر ہوتا رہا ہے، اور اب بھی ہے، ان سب پر مستزاد کہ اخبار کے چلانے یا قوم کے لیڈر بننے کا یہ ایک آسان نسخہ ہے، کہ فرقہ وارانہ جذبات کو برانگیختہ کر دیا جائے،

تاریخی ترتیب اور منطق کے استدلال تمثیلی کے لحاظ سے ہم کو ہندوؤں کی پچھلی تاریخ پر نظر ڈالنی چاہئے، یہ ظاہر ہے کہ ہندو کبھی ایران و عرب پر چڑھ کر نہیں گئے تھے، اس کے بجائے ان کے ملک پر خود ہم نے حملہ کیا، ہم نے اُن کا مشہور کعبہ "سومنات" برباد کر دیا، ہم نے بنارس اور متھرا کے شوالے ویران کر دیئے،

ہندوؤں کی خاندانی روایتیں ان زخموں کو ہمیشہ ہرا رکھتی ہیں، لیکن جب اکبر نے ایک دفعہ محبت کی نگاہ اٹھا کر ان کی طرف دیکھ لیا، تو یہی زخم خوردہ دل محبت سے چور تھے، بہادر راجپوتوں اور مہاراجوں نے نہ صرف جان و مال، بلکہ اپنا ننگ و ناموس تک حوالہ کر دیا، یعنی بیٹیاں تک دیدیں،

یہ اکبر کا جبر اور راجپوتوں کا خوشامدانہ کام نہ تھا، جبر اور خوشامد دل کی رگوں میں گھر نہیں کر سکتے، جہانگیر کا بیٹا (خسرو) باغی ہوا تو اس کی ماں نے جو جے پور کی رانی تھی، خسرو کو بہت سمجھایا، لیکن جب وہ ناخلف نہ مانا، تو یہ غیرتمند راجپوتنی یہ نہ دیکھ سکی، کہ اس کی کوکھ بغاوت سے داغدار ہو، اس نے افیون کھالی اور مرگئی، جہانگیر اس کی غیرتمندانہ شرافت کی داد ان الفاظ میں دیتا ہے،

"مکرر بخسرو مقدمات نوشت، وا ورا دلالت بہ اخلاص و محبت من می کرد، چوں دید کہ ہیچ فائدہ ندارد، عاقبت تا معلوم است کہ کجا منجر خواہد شد، از غیرتے کہ لازمۂ راجپوتانی است، خاطر بزرگ خود قرار داد"

جہانگیر پر اس وفاداری کا جو اثر ہوا، خود اس کے الفاظ میں سننا چاہئے،

"ازفوت او بنابر تعلقے کہ داشتم ایامے برمن گذشت کہ از حیات و زندگانی خود ہیچ گونہ لذتے نہ داشتم، چہار شبانہ روز کہ سی و دو پہر باشد از غایت کلفت و اندوہ چیزے از ماکول و مشروب وارد طبیعت نہ گشت۔"

یعنی اوس کے مرنے سے مجھ پر ایسے دن گذرے کہ اپنی زندگی سے مجھکو کچھ حظ نہیں ملتا تھا چار دن رات کہ بتیس ۳۲ پہر ہوتے ہیں، کھانے پینے کی کوئی چیز میں استعمال نہ کر سکا،

یہ سچے جذبات، یہ حیرت انگیز محبت، یہ جگر گداز اثر، خوشامد سے نہیں پیدا ہوتے،

اکبر کے دربار کے ستون اعظم بیرم خاں، خان اعظم کوکلتاش، بہادر خاں صوبہ دار تھے، ان میں کس کا دامن بغاوت کے داغ سے پاک ہے؟ لیکن یہ بدنامی کسی ہندو راجہ نے نہیں اٹھائی، مان سنگھ کو اکبر نے راجپوتوں کے قبلۂ اعظم، یعنی مہارانا اودے پور کے مقابلہ پر بھیجا، جس کی یہ عزت تھی کہ جب وہ اپنے پاؤں کے انگوٹھے سے راجاؤں کی پیشانی پر تلک لگاتا تھا، تب وہ راجہ ہو سکتے تھے، مان سنگھ بے عذر گیا، اور راودے پور سے معرکہ آرا ہو کر فتح حاصل کی،

اکبر سے لے کر عالمگیر تک کس درباری ہندو نے بغاوت کی؟ عالمگیر کے مقابلہ میں ہندو بے شبہہ تلوار لے کر بڑھے، لیکن کیوں؟ اس لئے نہیں کہ وہ مسلمان ہے، بلکہ اس لئے کہ وہ شاہجہاں کی مرضی کے خلاف دارا شکوہ کا باغی ہے، اس وقت عالمگیر اور دارا شکوہ، دو حریف مقابل تھے، ہندوؤں نے عالمگیر کے مقابلہ میں دارا شکوہ کا ساتھ دیا، کیونکہ وہ شاہجہاں کا ولیعہد تھا، عین معرکۂ کارزار میں جب راجہ روپ سنگھ (مہارانا اودیپور کا نواسا) فوجوں کو چیرتا ہوا عالمگیر کے قریب پہنچ گیا، تو للکار کر بولا "ارے تو دارا کا مقابلہ کرنے چلا ہے"، اس فقرہ کا

لہجہ بتاتا ہے کہ وہ ہندوپن کے جوش سے نہیں، بلکہ دارا کی محبت سے نکلا ہے،

شاہجہاں کے بعد بعض اطراف میں ہندوؤں نے بغاوت کی، لیکن وہ ایک مذہبی غلط فہمی پر مبنی تھی، اور کوئی راجہ یا مہاراجہ اس میں شریک نہ تھا، اور وہ بہت جلد فرو ہو گئی، عالمگیر دکن چلا گیا، اور پچیس برس تک دہلی کا پایہ تخت خالی رہا، اس سے بڑھکر راجپوت راجاؤں کے لئے کیا عمدہ موقع تھا کہ دہلی پر حملہ آور ہوتے، یا کم از کم راجپوتانہ میں علم بغاوت بلند کرتے لیکن جے پور اور جودھ پور میں، جو راجپوتی طاقت کا مرکز تھے نکسیر تک نہ پھوٹی ہشیواجی نے البتہ بغاوت کی، سکھ بھی باغی ہوئے، لیکن یہ نوخیز ملکی دعویدار تھے، اس کو بغاوت سے تعلق نہ تھا، بلکہ خودسری اور نئی سلطنت کی ابھرنے والی قوت تھی، دنیا میں جن لوگوں نے اپنے دست و بازو سے نئی نئی سلطنتیں قائم کیں، کون ان کو باغی کہہ سکتا ہے؟ ورنہ تیمور اور اسکندر سے بڑھ کر کون باغی ہو سکتا ہے،

یہ پرانی داستان تھی، آج بھی دیہات اور قصبات میں چلے جاؤ تو ہندو اور مسلمان بھائی بھائی کی طرح ملتے ہیں، وہ اسی طرح مسلمانوں کی تقریبات میں شریک ہوتے ہیں جس طرح خود ان کے عزیز اقارب شریک ہوتے ہیں،

ایک سال میں نے پٹیالہ میں عید کی نماز ادا کی، عیدگاہ کی عمارت اچھی دیکھ کر میں نے سوال کیا تو معلوم ہوا کہ مہاراجہ پٹیالہ نے اس کی تعمیر میں معقول امداد دی ہے، یہ بھی معلوم ہوا کہ راجہ کا عام حکم ہے کہ جب کوئی نئی مسجد تعمیر ہو تو کم از کم خزانہ ریاست سے چھ سو روپیہ دیئے جائیں، حالانکہ مہاراجہ کا خاندان سکھ ہے، جو مسلمانوں کا سب سے بڑا حریف فرقہ سمجھا جاتا ہے،

کہا جاتا ہے کہ ہندو ہماری قومی زبان اردو کو مٹا رہے ہیں، لیکن کیونکر؟ کیا اس طریقہ سے کہ اردو زبان کے عمدہ سے عمدہ ترمیگزین اور رسالے (ادیب اور زمانہ) ہندو نکال رہے ہیں

اور اُردو مصنفین کی قدر افزائی کرکے بہت سے نئے انشا پرداز ان اردو تیار کر رہے ہیں ؟ کیا اس طریقہ سے کہ ممالک متحدہ کے قابل ہندو، اردو انشا پردازی میں مسلمان انشا پردازوں کے دوش بدوش چل رہے ہیں ؟ زمانہ کے اوراق الٹتے ہوئے بارہا میں نے ہندو مضمون نگاروں کو تنگی نگاہ سے دیکھا ہے، کیا اس طریقہ سے کہ پولیٹکل معلومات کے لحاظ سے اُردو کا بہترین پرچہ "ہندوستانی" ہے ؟ جس کو ایک ہندو اڈیٹ کرتا ہے،

اسی کے مقابلہ میں مسلمانوں نے اردو پرستی کا کیا ثبوت دیا ہے ؟ ممالک متحدہ میں ان کا کونسا علمی پرچہ ہے ؟ ان کی انجمن اُردو کس مرض کی دوا ہے ؟ اردو مصنفین کی کیا قدر افزائی کی جا رہی ہے ؟

ہندوؤں کا سب سے بڑا جرم نیشنل کانگرس قائم کرنا تھا جس نے اب تک دونوں گروہوں میں حد فاصل قائم کر دی ہے لیکن سوال یہ ہے کہ اگر مسلمان اپاہج بنے بیٹھے رہے، اور اگر وہ پالیٹکس سے خوف کھاتے رہے اگر ان کو وسیرائے کی کونسل کے بیٹھنے کے بجائے لونڈوں کے ساتھ مکتب میں بیٹھنا زیادہ پسند تھا، اگر ان میں کسی قسم کا عزم، حوصلہ، ہمت، اور حقوق طلبی نہ تھی، تو کیا ہندوؤں کا یہ فرض تھا، کہ وہ بھی اپاہج اور بے دست و پا بن جاتے،

ان تمام خیالات سے اگرچہ ہمارے فرضی رہبروں کا گروہ مخالف ہے لیکن مخالفت کا نفس واپسیں ہے، قوم تیس برس تک احمق بن چکی، اب اس کے حال پر رحم کھانا چاہئے، اور قوم کو سمجھنے دینا چاہئے کہ یہ پولیٹکل سوانگ حقیقت میں پالیٹکس نہیں ہے،

(مسلم گزٹ لکھنؤ)

۹ / اکتوبر سنہ ۱۹۱۳ء

---

(۵)

پچھلے آرٹیکل میں ہم نے مسلم لیگ کی موجودہ حالت اور ہندو مسلمانوں کے اتحاد کے متعلق بحث کی تھی ہمکو مسرت ہے کہ مضمون کے پہلے حصہ سے اکثر بزرگوں کو اتفاق ہے اور قوم کے بعض نہایت ممتاز لیڈروں نے ہمکو یقین دلایا ہی کہ اب کے سالانہ اجلاس میں لیگ کا نظام قریبًا بدل دیا جائیگا، اور جو تجویزیں ہم نے لیگ کی اصلاح کی پیش کی ہیں، قریب تر لیگ اسی قالب میں ڈھل جائیگی، اگر یہ صحیح ہے تو پھر ہمکو لیگ کی مخالفت کی کوئی وجہ نہیں ہوگی اور ہم سب سے پہلے اس کے آگے گردن جھکا دیں گے،

لیکن آرٹیکل کے دوسرے حصہ نے ہمارے اکثر اعزہ اور احباب بلکہ قریبًا تمام قوم کو آزردہ کر دیا ہے، اور سچ یہ ہے کہ اون کی یہ آزردگی بیجا بھی نہیں ہے، ہماری نیت گو کچھ ہی ہو اور گو اس پیرایہ کے اختیار کرنے کی کوئی وجہ ہوئی ہو لیکن یہ بالکل سچ ہے کہ اس مضمون نے بظاہر میزان عدل کا ایک پلہ بالکل جھکا دیا ہی، ہم نے ہندوؤں کی وفاداری اور نیک طبعی کی قدر دانی کی، لیکن مضمون کے پڑھنے والے پر ساتھ ہی یہ اثر پڑتا ہے کہ مسلمان قابلِ الزام تھے، مسلمانوں کی بت شکنی کا ہم نے ایسے لفظوں میں ذکر کیا جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہم مسلمانوں کو مجرم سمجھتے ہیں مضمون سے مجموعی طور پر یہ اثر بھی پڑتا ہے کہ ہندوں نے مسلمانوں کے ساتھ جو وفاداری کی یہ اُن کا احسان تھا مسلمانوں کی فیاضی کی قیمت نہ تھی لیکن واقعہ یہ ہے کہ یہ دونوں خیال غلط ہیں، اس غلطی کی اصلی وجہ ایک اور غلطی تھی، یعنی ہم نے یہ فرض کر لیا کہ مسلم گزٹ کے تمام ناظرین ہمارے اُن مضامین کو پڑھ چکے ہیں، جو عالمگیر اور جہانگیر اور مسلمانوں کی بے تعصبی کے متعلق شائع ہو چکے ہیں،

مسلمانوں نے جس قدر بت شکنیاں کیں، مذہبی تعصب سے نہ تھیں، بلکہ اس کی وجہ یہ تھی کہ اُس زمانہ میں مذہب اور پالیٹکس مخلوط تھے یعنی حریف کی ملکی طاقت کا مٹانا بغیر اس کے نہیں ہو سکتا تھا کہ اس کی مذہبی طاقت کو بھی مغلوب کر دیا جائے، آج ایسے روشن زمانہ میں لارڈ کچنر کو مہدی سوڈانی کی قبر اسی غرض سے اکھڑوا کر برباد کر دینی پڑی، اور خود ہندوؤں نے اسی ضرورت سے اپنے زمانۂ اقتدار میں سینکڑوں مسجدیں برباد کر دیں، اسی بنا پر مسلمانوں نے حملہ کے وقت بتخانے گرا دیے، لیکن امن وامان اور تسلط کے بعد کبھی کوئی بت خانہ نہیں گرایا گیا، اور جو بت خانے گرائے گئے، اُن کے خاص پولیٹکل اسباب تھے، یہ مضمون اس قدر وسیع ہے کہ اس آرٹکل میں سما نہیں سکتا، اور اس لئے ہم بہ مجبوری اپنے ناظرین سے درخواست کرتے ہیں کہ وہ کم از کم مضامین عالمگیر مطبوعہ کانپور کو ایک دفعہ ملاحظہ فرمالیں،

اس مضمون میں ہم اس پہلو کو کسی قدر تفصیل کے ساتھ دکھانا چاہتے ہیں کہ ہندوؤں نے جو کچھ ہمارے ساتھ کیا وہ اُن کا احسان نہ تھا، بلکہ ہمارے احسانات اور فیاضیوں کی قیمت تھی، اور یہ کہنا مشکل ہے کہ یہ قیمت اصل مال کے برابر بھی تھی یا نہیں،

ہندوؤں کی وفاداری کا زمانہ اکبر سے شروع ہوتا ہے، اسلئے یہ تفصیل سننا چاہئے کہ اس واقعہ کی ابتدا کیونکر ہوئی اور کس طرح اُس نے وسعت حاصل کی،

ہمایوں کے زمانہ میں انبیر میں جو جے پور سے چند میل پر واقع ہے، ایک چھوٹی سی ریاست تھی، یہاں کا راجہ پرتھی راج کچھواہہ تھا، ہمایوں کے مرنے کے بعد جا بجا جو بغاوتیں برپا ہو گئیں، ان میں حاجی خاں نے جو شیر خاں کا غلام تھا، نارنول کا محاصرہ کیا،

اس محاصرہ میں پرتھی راج کا بیٹا راجہ بھارامل بھی شریک تھا، نارنول پر مجنون خاں قابض تھا، جو ہمایونی امرا میں تھا، راجہ بھارامل نے مجنون خاں سے دوستانہ نامہ وپیغام کرکے نارنول کو لے لیا، اور مجنون خاں کو عزت وآبرو کے ساتھ رخصت کردیا، جب اکبر نے کاروبار سنبھالا تو مجنوں خاں نے راجہ بھارامل کے اوصاف اکبر سے بیان کئے، اکبر قابلیت ولیاقت کا عام قدردان تھا، فوراً طلبی کا فرمان گیا، اور تخت نشینی کے پہلے ہی سال راجہ مذکور نے ملازمت شاہی حاصل کی،

ایک موقع پر جب اکبر مست ہاتھی پر سوار ہو کر نکلا، تو ہاتھی جس طرف رُخ کرتا تھا لوگ پھٹ جاتے تھے، اتفاق سے ہاتھی راجہ بھارامل کی طرف جھکا، راجہ مع اپنے راجپوتوں کے اپنی جگہ پر جما رہا، اکبر دلیرانہ اداؤں کا شیدا تھا، بے اختیار راجہ کی طرف دیکھ کر بول اٹھا کہ "تجھکو نہال کردوں گا"

سنہ ۶ جلوس میں چونکہ راجہ کے بھتیجے راجہ سوجا نے سرکشی کی تھی، اس لئے اجمیر کے صوبہ دار نے اسکو شکست دے کر چاہا کہ انبیر پر قبضہ کرلے، راجہ بھارامل نے پہاڑوں میں جاکر پناہ لی اسی سال اکبر اجمیر کی زیارت کو گیا، اور جب اس کو یہ حال معلوم ہوا تو راجہ بھارامل کو بلا بھیجا، راجہ نے سانگانیر میں آکر باریابی حاصل کی، اور پہلے ہی دربار میں اکبر نے اسکو انعامات اور قدردانیوں سے اس قدر زیربار کردیا کہ راجہ نے خود قرابت کی درخواست کی، اکبر نے منظور کیا، سانبھر میں شادی کی رسمیں ادا ہوئیں، اور راجہ کی لڑکی حرم شاہی میں داخل ہوئی، راجپوتی اور تیموری خون کی آمیزش کا یہ پہلا دن تھا[1]

راجہ کی وفاشعاری کا جو صلہ اکبر نے دیا وہ یہ تھا کہ راجہ جو ابھی تک ایک معمولی راجہ تھا

[1] "عرش آشیانی (یعنی اکبر) پایۂ قدر او را از جمیع راجہا و رایان ہندوستان گذرانیدہ"

فرزندان و بنائر و اقوام او را بہ مراتب بزرگ و مناصب ارجمند اعتبار بخشیدہ سر آمد اعیان و ارکان ہندوستان ساخت (مآثر الامرا جلد ۲ صفحہ ۱۱۳)

راجہ بہارا مل کے بعد راجہ بھگونت داس اسکا جانشین ہوا، اکبر نے اسکی بیٹی سے شاہزادہ سلیم (جہانگیر) کا عقد کیا،

اکبر نے دلہن کی جو عزت افزائی کی، دنیا کی تاریخ اس کی کوئی مثال پیش نہیں کر سکتی، ہم اپنے ناظرین کو اجازت دیتے ہیں کہ وہ جس حد تک چاہیں قیاس کے جولانگاہ کو وسعت دیں اور دیکھیں کہ کیا طائر وہم بھی اس حد تک پہنچ سکتا ہے؟ کیا دلہن پر زر و جواہر نثار کیے گئے؟ کیا تمام راستہ میں مخمل و کمخواب کے پا انداز ڈالے گئے؟ کیا دو کرور کا مہر بندھا؟ ہاں یہ سب ہوا لیکن یہ کوئی چیز نہ تھی، اکبر جو دنیا کا اس وقت سب سے بڑا شہنشاہ تھا، اور شاہزادہ سلیم جو آگے چل کر جہانگیر ہوا، اور جو شاہزادگی میں بھی شاہنشاہوں کے برابر تھا، دلہن کے محافہ کو کہار بنکر اپنے کندھوں پر لائے[۱]، کیا ہندوؤں میں کسی راجہ مہاراجہ نے اپنی بہو کو یہ عزت دی ہے، کیا خود اکبر نے شہزادیان تیمور کے لئے یہ ننگ گوارا کیا؟

اکبر و جہانگیر و شاہجہاں وغیرہ کے احسانات صرف سوشل احسانات نہ تھے، پولیٹکل احسانات اس سے بھی زیادہ تھے، اور سچ یہ ہے کہ کسی قوم نے اپنی مفتوح قوم کو یہ عزت یہ حقوق یہ درجہ کبھی نہیں دیا، آج کلکٹری اور کمشنری کے عہدے ہندوستانیوں کے لئے منتہائے خیال ہیں لیکن تیموریوں نے وزارت اعظم اور سپہ سالاری تک ہندوؤں کو عنایت کی،

(معارف نمبر ۱ جلد ۱)

ماہ رمضان المبارک ۱۳۳۴ھ مطابق جولائی ۱۹۱۶ء

---

[۱] مآثر الامرا جلد دوم صفحہ ۱۰۳،

لیڈروں کا قصور ہے

یا

لیڈر بنانے والوں کا؟

ہمیں یہ صاف نظر آرہا ہے کہ ہندوستان کی اسلامی دنیا میں لیڈروں کی طرف سے ایک عام بغاوت کی ہوا چل گئی ہے، لیکن ہم کو نہایت غور اور احتیاط سے دیکھنا چاہئے، کہ جس طرح چالیس برس سے ہم اپنے لیڈروں کی کورانہ غیر معتدل غلامی کرتے رہے، اسی طرح اس بغاوت میں بھی ہم اعتدال کی حد سے متجاوز تو نہیں ہو گئے ہیں، اور یہ کہ آزادی تقریر میں ہماری تیر اندازی کا نشانہ غلط تو نہیں قائم ہو گیا ہے،

اس میں کوئی شبہہ نہیں کہ وہ لوگ جو بڑے بڑے لمبے خطاب رکھتے ہیں، جو بڑی بڑی جائدادوں کے مالک ہیں، جن کو اپنے ذاتی معاملات کی وجہ سے ہر وقت حکام کی خوشنودی کی نبض دیکھتے رہنے کی ضرورت پڑتی ہے، وہ قوم کے لیڈر نہیں ہو سکتے، وہ کسی طرح آزادانہ رائے نہیں دے سکتے ان کی جو پوزیشن ہے وہ جس کو حاصل ہو جائیگی، اوس کو بھی وہی کرنا پڑیگا جو وہ کر رہے ہیں، بلکہ مجھکو شبہہ ہے، کہ جو لوگ ان لیڈروں پر معترض ہیں، اگر وہ بھی ان ہی مجبوریوں میں گرفتار ہو جائیں، تو وہ ان موجودہ لیڈروں کے برابر بھی آزادی سے کام نہ لے سکیں گے،

لیکن سوال یہ ہے کہ لیڈروں کا کیا قصور ہے؟ کیا انھوں نے خود لیڈر بننے کی خواہش کی؟
کیا انھوں نے اپنا نام پیش کیا؟ کیا وہ اس کے لئے کوئی کوشش کرتے ہیں؟ میں نے خود دیکھا کہ
سر آغا خاں صاحب نے نہایت سچے اور بے ریا دل سے لیگ کی پریسیڈنٹی سے استعفا دیدیا
اور اس پر سخت مصر ہوئے لیکن لوگوں نے نہ مانا، اور ان کو اس قدر مجبور کیا کہ ایسی حالت میں انکار کرنا
انسانیت کی حد سے گذر جانا تھا، میں اس وقت موجود تھا جب نواب صاحب ڈھاکہ عام مجمع کے سامنے
کہہ رہے تھے کہ لیگ کے جلسہ میں یہ میری اخیر شرکت ہے، اور نو نو کے نعروں سے سارا ہال گونج رہا تھا
اس سے انکار نہیں ہو سکتا، کہ ایسے بھی لیڈر ہیں جو لیڈری کے خواستگار ہیں، اور جو اس کے
لئے کسی قسم کی کوشش سے دریغ نہیں کرتے لیکن یہ انصاف کی بات نہیں، کہ ان کی وجہ سے ناکردہ
گناہ بھی الزام میں شریک کر لئے جائیں حقیقت یہ ہے کہ محسن اور لیڈر دو جدا گانہ منصب ہیں اور
ان دونوں کی حیثیتیں صاف صاف الگ کر لینی چاہئیں، مثلاً سر آغا خاں نے یونیورسٹی کے معاملہ
میں وہ کام کیا جو آج تک سات کروڑ مسلمانوں سے نہ ہو سکا، اور غالباً کبھی نہ ہو سکتا، انھوں نے
قومی انسٹی ٹیوشن پر فیاضی کا مینہ برسا دیا، اسی بنا پر وہ ہمارے محسن ہیں اور ہمکو انکا احسان ماننا چاہئے
قومی مجالس میں اُن کی فیاضیوں اور کوششوں کا ترانا گانا چاہئے، قومی تاریخ میں ان کا نام سب سے
اوپر لکھنا چاہئے لیکن وہ ہمارے پولیٹکل لیڈر نہیں ہیں، ان کی عمر کا تمام حصہ پولیٹکل زندگی سے الگ
گذرا ہی، ان کو پولیٹکل لٹریچر کے دیکھنے کا بہت کم موقع ملا ہے، انھوں نے اس فن کا مطالعہ نہیں
کیا ہے، اس کے ساتھ ان کے تعلقات اور معاملات آزادی کی اجازت نہیں دے سکتے، اس لئے
ہم کو اُن کا وہ منصب قرار دینا چاہئے جو امریکہ میں راک فیلر اور کارنیگی کا ہے کہ تمام امریکہ انکی
قومی فیاضیوں کا غلام ہے تاہم کوئی شخص انکو لیڈر کے خطاب سے مخاطب نہیں کر سکتا،
لیڈری کے لئے وہ شخص درکار ہے، جو سٹر گوکھلے کی طرح خطاب، جائداد، دولت اور

تمام تعلقات سے آزاد ہو، پرجوش اور دلیر ہو اس کے ساتھ پالیٹکس کا ماہر ہو، اور پولیٹکل لٹریچر کا مدتوں مطالعہ کرچکا ہو، اگر قوم میں ایسے شخص موجود نہیں ہیں، تو لیڈری کے تخت کو اور بھی چندروز خالی رکھنا اور واقعی تخت نشین کا انتظار کرنا چاہئے، سچ اور بالکل سچ یہ ہے کہ لیڈروں کا نہیں بلکہ لیڈر بنانے والوں کا قصور ہے، اس لئے کہ وہ پہلے ایک شاہنشاہی قائم کرتے ہیں تاکہ اس کے سایہ میں اور چھوٹی چھوٹی حکومتیں قائم ہوسکیں جنہیں سے کوئی حکومت ان کے بھی زیرنگیں آجائے، اسلئے ہمکو لیڈروں سے نہیں بلکہ لیڈرگروں سے بچنا چاہئے،

(۱۸ مارچ سنہ ۱۹۱۲ء۔ مسلم گزٹ۔ لکھنؤ)

مسئلہ آرمینیا

آرمینیا کے متعلق اگرچہ معلومات کے ذریعے جو موجود ہیں وہی انگریزی اخبارات ہیں جنھوں نے اور جن کی قوم نے ترکوں کے برباد کرنے کا گویا احرام باندھ لیا ہو تاہم یہ عجیب بات ہی کہ ان جھوٹے ظلموں میں بھی سچ کے آثار صاف صاف نظر آتے ہیں، ریوٹر کے تاروں کے باہمی تناقض اور بے سروپائی نے خود بتادیا کہ ان میں جھوٹ کا کس قدر حصہ ہے؟ انگریزی اخبارات کی طرزِ تحریر سے خود ثابت ہوگیا، کہ ان کا اصلی مقصود کیا ہی؟۔

تاہم نہایت مفید ہوگا اگر ہم یہ پتہ لگائیں کہ آرمینیا کے مسئلہ کے متعلق دوسری قوموں کے کیا خیالات اور کیا معلومات ہیں؟ بیروت کے مشہور اخبار ثمرات الفنون نے اس پر ایک بسیط آرٹیکل لکھاہے اور دعویٰ کیاہے کہ فرانس جرمنی وغیرہ کے تمام اخبارات اس مسئلہ میں انگریزوں کے برخلاف ہیں، وہ علانیہ لکھتے ہیں کہ ان تمام ہنگاموں میں آرمینیوں ہی کی شرارت ہے، اور انگریزوں نے جو اون کی حمایت کا بیڑا اُٹھادیا ہے، یہ فقط ایک خودغرضانہ حکمت عملی ہے، اخبار مذکور نے بہت سے اخباروں کو نام بنام گنایا ہی مثلاً دیباسیاکل، کورسپوانس، دولست، اندپندانس بلج، نایہ فرپاد، پادمدنبلاٹ، گالوا، دیہ فرنخ و جرمن اخبار ہیں لیکن تلفظ کے نہ معلوم ہونے سے نام کی صحت نہیں ہوسکتی ہی اخبار مذکور نے فرانس کے نہایت مشہور اخبار الپتی ژورنال کے ایک آرٹیکل کا ترجمہ چھاپا ہے

چنانچہ اس موقع پر ہم اوس کا خلاصہ نقل کرتے ہیں، وہ لکھتا ہے کہ

"ہم نے کچھ دن پہلے جو لکھا تھا، وہ سچ نکلا کہ دنیا کا امن وامان ٹرکی حکومت کے قائم رہنے پر موقوف ہے، اور یہ کہ انگلستان ٹرکی کے انتظامات میں جس قسم کی مداخلت کر رہا ہے، وہ عام امن وامان کو ضرر پہنچانے والا ہے،

موجودہ واقعات نے ثابت کر دیا کہ آرمینیوں کے ہنگامے کی تحریک درحقیقت خود انگلستان نے کی، بلکہ ٹرکی میں جو خودسر جماعت پیدا ہو گئی ہے وہ انگلستان ہی کے اغوا کی وجہ سے ہوئی ہے، انگلستان چند روز تک اس معاملہ میں چپ رہا لیکن یہ سکوت بھی دھمکی کا ثبوت تھا لیکن جب اُس نے مہر سکوت توڑی تو بجائے اس کے کہ امن کی طرف اس کا میلان ہو، اس نے اور زیادہ برہمی پیدا کی، چنانچہ فارن سکریٹری نے اپنی اسپیچ میں کہا کہ بیرونی معاملات پُرخطر ہیں،

اس کے بعد لارڈ سالسبری نے گلڈ ہال میں اسپیچ دی جسمیں بہت کچھ مدمغانہ خیالات اور متناقص بیانات تھے، تاہم چونکہ لارڈ موصوف کو یہ معلوم ہے کہ تمام اسلامی دنیا اور خود ہندوستان میں سلطان المعظم کو مسلمان کس نگاہ سے دیکھتے ہیں، اس لئے اون کی تقریر میں نرمی اور چاپلوسی کا پہلو بھی تھا،

اس معاملہ میں جو سلطنتیں انگلستان کے پیچھے پیچھے چل رہی ہیں وہ اٹلی اور آسٹریا ہیں، جن کو موہوم امیدوں نے اس کارروائی پر آمادہ کیا ہے، یہ ظاہر ہے کہ جرمنی بوجوہات مختلفہ اس جھگڑے سے بالکل الگ ہے، اور سلطنت روس و فرانس نے سچے دل سے سلطان کی دوستی کا اظہار کیا ہے، فرانس اس بات کو ہمیشہ نفرت کی نگاہ سے دیکھتا رہا ہے، کہ اصلاح اور رفارم کے بہانے سے ٹرکی کے معاملات میں دست اندازی کیجائیگی"

اس موقع پر ہم مناسب سمجھتے ہیں کہ ٹرکش گورنمنٹ نے آرمینیوں کے ساتھ جو رعایتیں ملحوظ رکھی ہیں ان کا مختصر سا تذکرہ کیا جائے، جس سے معلوم ہوگا کہ انگریزی اخبارات نے آرمینیوں کی مظلومیت کی جو تصویر کھینچی ہے وہ کہاں تک صحیح ہے؟

مصر کے مشہور اخبار المؤید نے ایک بسیط آرٹیکل اس عنوان سے لکھا ہے ((دولت عالیہ کے احسانات آرمینیوں پر)) چنانچہ اس کا خلاصہ ذیل میں درج ہے،

"خاص قسطنطنیہ میں آرمینیوں کے ۲۹ گرجے، ۱۵۱ ابتدائی مدرسے، ۵۷ اسکول، اور ایک صنعت کا مدرسہ ہے جس میں ۴۲۵ لڑکے تعلیم پاتے ہیں، لڑکیوں کی تعلیم کے جدا مدرسے ہیں جن میں تین ہزار لڑکیاں تعلیم پاتی ہیں،

اس کے سوا خاص سلطانی مدارس میں کثرت سے ارمنی داخل ہیں یہاں تک کہ بعض کالجوں میں زیادہ تعداد آرمینین طالب العلموں کی ہے،

محلہ "یدی قولی" میں ان کا ایک خاص ہسپتال ہے، جسمیں سلطان کی طرف سے روزانہ ڈھائی من روٹی اور ۵ آثار گوشت مقرر ہے، اسی طرح ان کے یتیم خانہ کے لئے خاص سلطان کی طرف سے اسی قدر گوشت اور جنس روزانہ مقرر ہے، ان کی تعلیم کی ترقی کیلئے چار سوسائٹیاں قسطنطنیہ میں قائم ہیں، جن میں سے ایک جو سب سے بڑی ہے، سلطان کے انعامات سے ہمیشہ بہرہ یاب رہی ہے، اس سوسائٹی کے ماتحت تمام ٹرکش حکومت میں ۳۵ عام اسکول اور دس زنانہ اسکول قائم ہیں جنمیں ۵ ہزار لڑکے اور لڑکیاں تعلیم پاتی ہیں،

ان سب سے بڑھکر یہ کہ سررشتہ تعلیم کی طرف سے ہمیشہ جو طالب العلم یورپ کے مختلف شہروں میں تعلیم پانے کی غرض سے بھیجے جاتے ہیں، ان میں اکثر ارمن لڑکے ہیں جن کا خرچ سررشتہ تعلیم یا سلطان کی جیب خاص سے ملتا ہے،"

ٹرکی حکومت کے مختلف مقامات میں جو انجمنیں، کتب خانہ، علمی سوسائٹی قائم ہیں عموماً سب کو سلطان کی طرف سے مدد ملتی ہو،

ٹرکی نے آرمینیوں کے فساد روکنے اور انگلستان کے بیجا دباؤ کے مقاومت کے لئے جو تیاریاں کیں اس کا مفصل حال اگرچہ اس وجہ سے نہیں معلوم ہوسکتا کہ ٹرکی اخبارات پولٹیکل معاملات کے متعلق کچھ لکھنے کے مجاز نہیں ہیں، تاہم چھوٹی چھوٹی لوکل خبروں سے جس قدر مفہوم ہوتا ہو یہ ہے کہ ۵ لاکھ فوج ہر قسم کے سامان سے لیس ہو کر تیار ہو گئی جنمیں سے ڈھائی لاکھ دار السلطنت میں مقیم ہے، اور باقی مختلف مقامات میں روانہ ہو چکی ہے اور جہاں جہاں قلعہ اور دمدمے تھے سب جگہ کثرت سے آلاتِ جنگ بھیجدیئے گئے ہیں،

آرمینیا کے اضلاع میں امن وامان قائم ہوجاتا ہو اور ارمنی اپنی حرکات سے نادم ہو کر سرکاری حکام کے پاس حاضر ہوتے جاتے ہیں،

"چوں مرزن" جہاں بہت بڑا فساد ہوا تھا وہاں کے تمام ارمنی، ۲ تاریخ ماہ تشرین کو جوق کے جوق جمع ہوئے اور فوجی افسروں کے پاس حاضر ہو کر بآواز بلند پکارے کہ "باشاہ ہم جوق یشان (یعنی ہمارا بادشاہ ہمیشہ زندہ رہے)، چنانچہ اسی وقت ترکی فوج جو موقع پر موجود تھی، فوجی قاعدہ سے صف آرا ہوئی، اور آرمینیوں نے اون کے سامنے حلقے باندھے، ثابت پاشا نے وسط میں کھڑے ہو کر ایک پر اثر تقریر کی، اوس وقت سب نے مل کر "بادشاہ ہم جوق یشا" کا نعرہ بلند کیا، اس کے بعد مسلمان رعایا اور آرمینیوں نے اپنے اپنے غول سے دو سردار انتخاب کئے، دونوں سرداروں نے نہایت دوستانہ طریقہ پر

بڑھکر ایک دوسرے کا شانہ چوما اور صلح و محبت کا اعلان عام دیدیا گیا،

اسی طرح اور مقامات میں بھی امن و امان قائم ہوتا جاتا ہے، افسوس ہے کہ انگریزی اخبارات ان واقعات پر پردہ ڈالتے ہیں، اور سچ کو ظاہر ہونے نہیں دیتے،

آزاد۔ لکھنؤ

۱۲ر فروری ۱۸۹۶ء

(متفرق)

اضلاعِ سرحدی کا مختصر دورہ

مولوی غلام محمد صاحب شملوی وکیل ندوہ پشاور میں مقاصدِ ندوہ کی اشاعت کے لئے گئے تھے، وہاں کے لوگوں نے خواہش کی کہ خاکسار اور مولانا شاہ سلیمان صاحب کی زبان سے یہ مقاصد زیادہ دلنشین ہوں گے، اس تحریک پر ۲۲ر مارچ ۱۹۰۹ء کو ہم لوگ لکھنؤ سے روانہ ہوئے اور ۲۴ر کی صبح کو پشاور پہنچے، اگرچہ ٹرین وہاں کچھ رات رہے پہونچتی ہے، تاہم اکثر معززین اسٹیشن پر موجود تھے جن میں حاجی کریم بخش صاحب سیٹھی تاجرِ اعظم اور مسٹر عبدالعزیز ایم اے اسسٹنٹ ریونیو کمشنر وغیرہ حضرات بھی تھے،

حاجی کریم بخش صاحب بہت بڑے تاجر ہیں اور حیرت یہ ہے کہ دولت مند ہوتے کے ساتھ عالم بھی ہیں، گویا مسلمانوں میں بھی علم اور دولت کا ساتھ ہو سکتا ہے، ہم لوگ ان ہی کے مہمان ہوئے، اور انھوں نے جس محبت اور فیاضی سے میزبانی کی اُن کے شایانِ شان تھا،

نواب سر کرنل اسلم خاں صاحب کے سی، آئی، ای، اور صاحبزادہ عبدالقیوم صاحب سی آئی، ای کے یہاں دعوتیں ہوئیں، محمڈن کلب کے ممبروں نے ڈنر دیا، ان سب صحبتوں میں ندوہ کے تذکرے رہے، خصوصاً ڈنر کے بعد جب نواب اسلم خاں صاحب نے میرے شکریہ کی تحریک کی، تو میں نے جواب میں ندوہ کے متعلق مفصل تقریر کی، اس ڈنر میں سرحد کے بعض بہت بڑے بڑے سردار شریک تھے،

حسنِ اتفاق یہ کہ ان ہی دنوں میں وہاں کے چیف کمشنر نے جو یہاں کے لفٹنٹ گورنر کے ہمرتبہ ہیں بڑا دربار کیا تھا جس میں سرحد کے تمام رؤسا اور خوانین شریک ہوئے تھے اس کے ساتھ گارڈن پارٹی بھی تھی جسمیں ہم لوگ بھی مدعو کئے گئے تھے،

چیف کمشنر صاحب سے میں مکان پر بھی ملا، ان کی ملاقات کا ڈھنگ تمام ہندوستان کے حکام انگریزی سے الگ ہے، ملاقاتیوں کے لئے ایک خاص کمرہ ہے جس میں پرتکلف کرسیاں، کوچیں، میز وغیرہ ہیں، جو شخص آتا ہے، پہلے وہاں بٹھایا جاتا ہے، اور اس کے سامنے چائے، حقہ، سگریٹ، سوڈا، لمینڈ، پیش کیا جاتا ہے، لوگ خوب حقے اڑاتے ہیں چائے پیتے ہیں، اور باہم گلخپ کرتے ہیں، نماز کا وقت آجائے اور کوئی نماز پڑھنی چاہے تو وضو کے لئے پانی اور جانماز بھی موجود رہتی ہے، چیف کمشنر صاحب نہایت خوش اخلاق ہیں، ملاقات کے وقت کھڑے ہو جاتے ہیں، چلتے ہوئے دروازہ تک پہونچاتے ہیں، رخصت ہونے کے وقت کہا کہ "خدا آپ کو دیر تک زندہ اور سلامت رکھے" اور غالباً یہ فقرہ سب کے لئے مبذول ہو،

محمڈن کلب ہال میں وعظ اور لکچروں کے متعدد جلسے ہوئے اور نہایت کثرت سے لوگوں کا مجمع ہوتا تھا، ودااعی جلسہ میں، میں نے صرف ندوہ کے مقاصد پر تقریر کی، اور لوگوں پر خاص اثر ہوا، تقریر کے بعد، لوگوں نے خواہش ظاہر کی، کہ یہاں بھی معین الندوہ یعنی ندوہ کی مؤید ایک انجمن قائم کیجائے، چنانچہ بزرگانِ ذیل نے خود اپنے نام پیش کئے،

جناب سردار میر عالم خانصاحب اکسٹرا اسسٹنٹ پشاور	پریسیڈنٹ
جناب میر جمیل احمد صاحب ناظر چیف کمشنر صاحب صوبہ سرحد	سکریٹری
جناب میاں عبدالعزیز صاحب اکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر پشاور،	ممبر
جناب راجہ سراج الدین صاحب تحصیلدار،	"

جناب میاں عنوان الدین صاحب ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ پولیس پشاور، ممبر

جناب محمد عظیم خاں صاحب اسسٹنٹ سرجن پشاور، ״

جناب قاضی محمد اکبر جان صاحب جاگیردار پشاور ״

جناب محمد اکرم خاں صاحب بی اے، چارسدہ ضلع پشاور، ״

جناب ... علی خاں صاحب نائب تحصیلدار ״ ״

جناب مولوی محمد سعید صاحب اسسٹنٹ انجنیر پشاور ״

جناب میرزا غلام صمدانی صاحب سپرنٹنڈنٹ ریونیو کمشنر صاحب بہادر صوبہ سرحدی، ״

جناب محمد عظیم خاں صاحب تحصیلدار ایبٹ آباد، ضلع ہزارہ، ״

جناب میاں محمد تسنیم خاں صاحب ٹھیکہ دار پشاور، ״

جناب میاں بدرالدین صاحب ہیڈ کلرک دفتر ریونیو کمشنر صاحب ״

جناب میاں وسیع الدین صاحب آرکیولاجیکل سٹری پرسنل اسسٹنٹ جناب سپرنٹنڈنٹ صاحب ״

جناب مفتی محمد شریف صاحب سب انسپکٹر پولیس صدر تھانہ پشاور ״

جناب بابو نور محمد صاحب ٹریزری اسسٹنٹ چھاؤنی ״ ״

جناب مفتی محمد حسین صاحب ناظر محکمہ جوڈیشل کمشنر صاحب بہادر صوبہ سرحدی، ״

اگرچہ پشاور کے بزرگوں نے پہلے ہی مولوی غلام محمد صاحب شملوی کے جانے کے وقت ندوہ کے لئے چندہ کی ایک رقم فراہم کر کے بھیجدی تھی، تاہم منیر جمیل احمد صاحب نے چاہا کہ جیسا کہ ندوہ کے سالانہ اجلاس میں قرار پایا ہے کہ دارالاقامہ (بورڈنگ) کا ایک ایک کمرہ ایک ایک شہر مسلمانوں کی طرف سے بنوایا جائے، اور اس کمرہ کی پیشانی پر اس شہر کا نام کندہ کیا جائے اس تجویز کے موافق، پشاور کی طرف سے بھی ایک کمرہ بنوایا جائے، چنانچہ اسکی کارروائی

شروع ہو گی اور امید ہے کہ عنقریب ایک ہزار کی رقم مہیا ہو جائے، اس رقم میں سے سو روپیے ہمارے پاس چک کے ذریعہ سے آ بھی گئے ہیں، جو میاں محمد قسیم صاحب نے عنایت فرمائے ہیں، پشاور میں جن بزرگوں نے ندوہ کیساتھ نہایت ہمدردی اور سرگرمی ظاہر کی، ان میں میر جمیل احمد صاحب، میاں عبدالعزیز صاحب، ڈاکٹر عظیم الدین صاحب، شیخ غلام محمد صاحب ڈپٹی سرٹ انسپکٹر کا نام خصوصیت کے ساتھ لینے کے قابل ہے، ہمارے میزبان حاجی کریم بخش صاحب کو خدا نے اس قدر مقدرت دی ہے کہ اگر وہ چاہیں تو اکیلے ندوہ کا دار الاقامہ بنوا سکتے ہیں لیکن وہ اس لئے ندوہ سے کسی قدر کشیدہ ہیں کہ ندوہ میں انگریزی کیوں پڑھائی جاتی ہے تاہم انھوں نے دس روپیہ ماہانہ ندوہ کے لئے مقرر کیا ہے، رخصت کے وقت مجھکو سو روپیے اور مولوی شبلی صاحب کو بیس روپئے رخصتانہ دیئے، ہم لوگوں نے بہت کہا کہ ہم لوگ رخصتانہ اور نذرانہ نہیں لیتے لیکن انھوں نے سخت اصرار کیا، بالآخر ہم نے وہ رقم لے کر ندوہ میں داخل کر دی، حسن اتفاق یہ کہ ہمارے عزیز دوست خواجہ سجاد حسین صاحب بی اے فرزند مولانا حالی صوبہ سرحدی کے افسر تعلیمات ہیں انھوں نے پچاس روپیے میری دعوت خشک کی مد میں پیش کئے، میاں عبدالرشید صاحب نے بھی پچاس روپئے دعوت کے دیئے یہ سب رقمیں ندوہ میں بھیجدی گئیں،

پشاور، کابل کا گویا خاکہ ہے، اکثر لوگ بلند بالا، تنومند، سرخ و سفید، اور قوی الجثہ ہوتے ہیں لیکن افسوس یہ ہے کہ شہر میں مختلف پارٹیاں ہیں اور باہم اتحاد نہیں، ایک اسلامیہ اسکول ہے جس کے اسٹاف میں ایک بھی گریجویٹ نہیں اور ہندوں کا اسکول ہے جو نہایت اعلیٰ درجہ کا اسکول ہے، اسلامیہ اسکول کے متعلق عمارت پچپن ہزار روپیے پر گرو ہے، حالانکہ عمارت کئی لاکھ کی ہے، بہر حال یہ قصہ دراز ست بہ پایاں کہ رسانند پشاور سے شاہ سلیمان صاحب حیدر آباد چلے گئے اور میں راولپنڈی آیا، یہاں

بھی ایک اسلامیہ اسکول ہے اور بہ نسبت پشاور کے اچھی حالت میں ہے، اس کے ہال میں میں نے
ندوہ کے مقاصد پر لکچر دیا، خواص و عوام ہر قسم کے لوگ نہایت کثرت سے تھے، جلسہ کا اہتمام
قاضی سراج الدین صاحب بیرسٹر، سیٹھ آدم جی صاحب مشہور تاجر، شیخ فضل الٰہی صاحب
اور عبد المجید خاں صاحب بیرسٹر کی طرف سے تھا، ندوہ سے لوگوں نے نہایت دلچسپی ظاہر کی، میں نے
یہاں سے بھی ایک کمرہ بننے کی تحریک کی تھی، اور لوگوں نے نہایت خوشی سے منظور کی، معین
الندوہ بھی قائم ہوئی لیکن ابھی تک ممبروں کے نام میرے پاس نہیں آئے،

میں راولپنڈی ہی میں تھا کہ مولوی محمد اشرف صاحب وکیل کوہاٹ یہاں آئے اور
کہا کہ مسلمانانِ کوہاٹ نے مجھکو آپ کے بلانے کے لئے بھیجا ہے، میں مولوی غلام محمد صاحب
شملوی کے ساتھ ۱۴ اپریل ۱۹۰۹ء کو صبح کے وقت کوہاٹ پہنچا، اسٹیشن پر تمام اکابر کوہاٹ تشریف لائے
تھے، یہاں کے لوگ جس جوش اور محبت کے ساتھ ہم لوگوں سے ملتے تھے، میں اس کا اثر
اب تک دل میں پاتا ہوں، یہ مشہور بات ہے کہ ع بود ہم پیشہ باہم پیشہ دشمن لیکن بخلاف
اور مقامات کے یہاں کے علما، اور قضاۃ، ہمارے ساتھ اس گرمجوشی کے ساتھ پیش آئے
کہ برادرانہ محبت کا لطف آتا تھا، اسلامی حکومت کے زمانے میں جو عہدے تھے ان میں سے
بعض کے نام باقی رہ گئے ہیں، اور بعضوں کا تو نام بھی نہیں رہا مثلاً محتسب کا عہدہ جسکو
ہندوستان میں عالمگیر نے زندہ کیا تھا، لیکن یہاں ایک خاندانی محتسب صاحب بھی
ہیں، اور اسی نام سے پکارے جاتے ہیں، ان کو اس عہدے کے معاوضہ میں جو زمین ملی
تھی، اب تک ان کے قبضہ میں ہے، حکام انگریزی نے بھی ان کا یہ لقب قائم رکھا ہے،
ان کے پاس چمڑے کا ایک درہ خاندانی میراث میں چلا آتا ہے لیکن ان کو بلکہ خود ہم کو
بھی اس بات کا افسوس ہے کہ غریب درہ کو اپنی خدمت کے انجام دینے کی اجازت

نہیں، کپڑے کا ایک غلاف ہے جس میں وہ اپنی افسردہ زندگی بسر کر رہا ہے، محتسب صاحب کو اپنے عہدہ کے لحاظ سے جابر اور تند مزاج ہونا چاہئے تھا، لیکن وہ اس قدر منکسر المزاج ہیں کہ اتنا انکسار تو میں بھی نہیں پسند کرتا،

اس شہر میں ایک اسلامی انجمن ہے جس کے سکریٹری خان بہادر سید سکندر شاہ صاحب ایک معزز خاندانی رئیس ہیں اسسٹنٹ سکریٹری مولوی سید اشرف صاحب وکیل ہیں، اور سچ یہ ہے کہ کوہاٹ میں جو کچھ قومی زندگی ہے ان ہی کے دم سے ہے،

سید سکندر شاہ صاحب کے اہتمام سے لکچر کا جلسہ منعقد ہوا، پہلے دن مولوی غلام محمد صاحب شملوی نے تقریر کی، اور گویا کوہاٹ کو مسخر کر لیا، دوسرے دن زیادہ اہتمام ہوا اور کئی کئی میل سے لوگ آئے شاید کوہاٹ میں آج تک اس جمعیت اور اقتدار کا کوئی جلسہ نہ ہوا ہوگا، میں نے اسلام کی جامعیت اور ندوہ کے مقاصد پر تقریر کی، اکثر ہندو اور آریہ صاحب بھی تشریف لائے تھے، وداعی جلسہ انجمن کے ہال میں منعقد ہوا، جس میں میں نے معین الندوہ کے قائم کرنے کی تحریک کی انجمن کے تمام ارکان نے جن کی تعداد اکاون تھی ممبری قبول کی، اسی وقت لوگوں نے ماہوار چندے بھی لکھوائے جسکی تعداد سینتالیس روپئے ماہوار ہے (اس کی تفصیل آئندہ چھپے گی) ماہواری چندے اگرچہ کم وصول ہوتے ہیں، لیکن بزرگان کوہاٹ کی نسبت اس قسم کی بدگمانی نہیں کی جا سکتی،

کوہاٹ کے لوگ نہایت سادہ، نیک دل، عقیدت کیش، اور فدائے اسلام تھے، لیکن تعلیم نہیں ہے، نہ کوئی ایسا مقتدا ہے، جو اُن کو ٹھیک راستہ پر چلائے چند رسمیں ان میں جاری ہیں جن کے مصارف ان کو پامال کئے ڈالتے ہیں، لیکن وہ

اس کے پنجہ سے چھوٹ نہیں سکتے،

رخصت کرنے کے وقت تمام بزرگانِ کوہاٹ اسٹیشن پر تشریف لائے، اور نہایت جوش اور محبت کے ساتھ ہم کو رخصت کیا،

بزرگانِ کوہاٹ نے بھی ایک کمرہ کی تعمیر کا ذمہ لیا، اور اُس کی پہلی قسط ایک سو سات روپئے نقد عنایت کی، اس میں ڈاکٹر عبدالقادر صاحب نے سو روپئے دینا منظور کیا،

(الندوہ نمبر ۳ جلد ۶)

ربیع الاول ۱۳۲۷ھ مطابق اپریل ۱۹۰۹ء

حضور نظام کی چالیسوین سالگرہ

اور

اراکین ندوۃ العلما کا تہنیت نامہ

ریاست حیدرآباد دکن کو علمی فیاضی کے لحاظ سے ہندوستان کی تمام اسلامی ریاستوں میں جو خصوصیت حاصل ہے، وہ محتاجِ بیان نہیں، کون نہیں جانتا کہ آج ہندوستان کے علمی گروہ کا ماوا و ملجا، سرپرست، قدردان دکن کا دارالحکومت حیدرآباد ہے، ہندوستان کی تمام علمی انجمنیں، قدیم و جدید علوم کے مدرسے اسی مبارک ریاست کی فیاضیوں کے ممنون ہیں، اس بنا پر یہ کہنا مبالغہ نہیں بلکہ واقعہ ہے کہ سلطنت آصفیہ خلدہا اللہ تعالیٰ کی علم پروری سے ہندوستان کا علمی حصہ نشو و نما پا رہا ہے،

وابستگانِ دولت آصفیہ کے لئے سال بھر میں وہ موقع بید مسرت کا باعث ہوتا ہے جب حکمرانِ ریاست اپنی زندگی کا ایک سال پورا کرتا ہے، اور خیر و برکت کے ساتھ دوسرے سال میں قدم رکھتا ہے، اس موقع پر وہ اپنا فرض سمجھتے ہیں کہ اپنی دلی عقیدت مندی کو ظاہر کریں، اور ریاست کے احسانات کا شکریہ ادا کریں، چنانچہ امسال وہ مسرت خیز موقع ماہ شوال میں انتالیسویں مرتبہ جلوہ افروز ہوا، اور (۱۷) سے (۲۳) شوال تک جشنِ سالگرہ قرار پایا

ندوۃ العلما اس موقع پر اظہار مسرت وعقیدت کے شرف سے کیونکر محروم رہتا؟
اس کا بڑا کارنامہ دارالعلوم ہے، جس نے ابھی ذہنی صورت بھی اختیار نہیں کی تھی، کہ اسی ریاست کی علم پروری نے اپنی فیاضی کے سنگ بنیاد سے اس کی بنیاد رکھی اس بنا پر اراکین ندوۃ العلما نے اپنی دلی عقیدت مندی کو ایک تہنیت نامہ کی صورت میں پیش کرنا چاہا، یہ طے پا چکا تھا کہ اراکین کا ایک منتخب وفد حیدرآباد میں حاضر ہو کے بالمشافہ حضور میں پیش کرے، اسی غرض سے خط وکتابت کی گئی، لیکن پرائیویٹ سرکار عالی مدار المہام کی مندرجہ ذیل چھٹی نے اس رائے میں تبدیلی کردی،

پولیٹکل سکرٹیری گورنمنٹ نظام؛

مراسلہ دفتر پرائیویٹ سکرٹیری مہاراجہ بہادر پیشکار و مدار المہام سرکار عالی واقع ۲۰ راکتوبر ۱۹۰۴ء

۲۰ر آذر ۱۳۱۵ف،

نشان

۵۳۴۴

حسب الحکم عالی جناب سر مہاراجہ بہادر یمین السلطنت مدار المہام سرکار عالی
پولیٹکل سکرٹیری گورنمنٹ نظام و
منجانب فریدونجی جمشیدجی اسکوئر سی۔آئی۔ای، پرائیویٹ سکرٹیری مدار المہام سرکار عالی

مقدمہ ملفوفہ

بخدمت معتمد صاحب دفتر ندوۃ العلما بمقام لکھنؤ،

بجواب مراسلہ نشان ۱۴۶۳ مورخہ ۶ ر شعبان ۱۳۲۲ ہجری نگارش ہے کہ عالی جناب مدار المہام ارشاد فرماتے ہیں کہ ندوۃ العلما کی جانب سے بتقریب جشن چہل سالہ سالگرہ مبارک اسقدر مسافت بعید

سے کوئی وفد بھیجنے کی زحمت گوارا نہ فرمائی جائے، اگر مجلس موصوفہ سے صرف تہنیت نامہ بھیجدیا جائے تو کافی ہوگا، جو بخوشی تمام بارگاہ خسروی میں گذران دیا جائیگا، فقط

محمد غوث

پرسنل اسسٹنٹ

اس بنا پر اراکین ندوۃ العلماء نے تعمیل ارشاد اپنا فرض سمجھ کر تہنیت نامہ مدار المہام بہادر کی خدمت میں روانہ کر دیا، تاکہ جشن چہل سالہ کے موقع پر حضور میں پیش کر دیا جائے،

تہنیت نامہ بجنسہٖ درج ذیل ہے،

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ؕ

بہ حضور لامع النور بندگان عالی متعالی رستم دوراں، افلاطون زماں، فلک بارگاہ مظفر الممالک فتح جنگ ہز ہائنس نواب میر محبوب علی خاں بہادر نظام الملک آصف جاہ سلطان دکن خلد اللہ ملکہٗ

سپاس ایزد دادگر کہ دیرینہ آرزو ہا راروز کامرانی رسید، تمنا را ہنگامہ گرم شد، عیش و خرمی بر خود بالید نشاط و طرب را روز بازار آمد یعنی آوازہ جشن چہل سالہ بندگان عالی جہان وجہانیاں را سامعہ نواز، و مایۂ صد گونہ بہجت و اہتزاز آمد،

و چوں نباشد، کہ عہد معدلت مہد شہریاری نہ ہمیں ممالک محروسہ آصفیہ را بہ ترقیہائے روزافزوں و کامرانیہائے گوناگوں نواختہ است، بلکہ در وسعت آباد ہند، ہیچ جائے و ناحیتے نیست کہ از تاب آفتاب فیض ایں دولت فروغانی نگشتہ باشد،

رہنمایان طریقت و پیشروان شرع و نکتہ سنجان سخن و طاعت گزاران مساجد، ہمہ را فیض گسترہائے کرم آصفی بہ نوعے کامروائے مطالب مقاصد گردانیدہ است کہ اگر ہر بن موئے ایشاں در ادائے سپاس

زبانے گردد باز ہم زعہدۂ ایں کار بدر نتواں آمد،

دیرُہ، انجمن "ندوۃ العلما"، راکہ برپا کردۂ انفاسِ قدسیہ پیشروانِ طریقت وجادہ شناسانِ شریعت ست از آغازِ کار طوقِ منت دولت ہمایوں در گردن ست وزمزمہ سپاسگزاری ومنت طرازی غلغلہ نوازِ بزم وانجمن،

اکنون کہ تقریب جشن چہل سالۂ بندگانِ شہریاری عالم وعالمیاں را مژدہ نواز آمد، ما ارکان واعضائے ایں جملہ انجمن بہ کمالِ اخلاص ونیاز ونہایت مسرت وابتہاج، مراسم تبریک وتہنیت را از تہ جان بجائے آریم، وبمقتضائے من لم یشکر الناس لم یشکر اللہ ادائے ایں فریضہ را از جملہ واجباتِ دینی می انگاریم واز صمیم قلب خواستگاریم کہ

تا جہاں باشد وایں گنبد گرداں باشد
دہر فرماں بہ محبوب علی خاں باشد

(الندوہ، نمبر ۱۱ جلد ۲)
ماہ ذیقعدہ ۱۳۲۳ھ مطابق ماہ جنوری ۱۹۰۶ء

———۰۰۰۰۰———

مولانا حالی کی ذرہ نوازی

خاکسار کے پاؤں کے زخمی ہونے پر بعض بزرگوں اور دوستوں نے رباعیاں لکھ کر بھیجیں، سید سلیمان اسسٹنٹ اڈیٹر الندوہ نے ان میں سے بعض پچھلے پرچے میں چھاپ دیں، انکو دیکھکر ہمارے مخدوم مولانا حالی نے منیجر الندوہ کو ایک خط لکھا جو بعینہ درج ہے،

"رسالہ الندوہ میں مولانا شبلی کے احباب کی رباعیات دیکھکر مجھے بھی یہ خیال ہوا کہ ان کے زمرۂ احباب میں ہونے کا فخر حاصل کروں لہٰذا ذیل کے چار مصرعے موزوں کرکے آپ کی خدمت میں بھیجتا ہوں، الندوہ کے کسی آیندہ نمبر میں ان کو بھی درج فرما دیجئے گا،

شبلی کہ گزند پاش پُر دل شکن ست | با خستگیش خجستگی مقترن ست
چنداں کہ بکاہند فزایند اینجا | کار استنِ چمن ز پیر استن ست

خاکسار الطاف حسین حالی،

از پانی پت ۱۶ ر اکتوبر سنہ ۱۹۰۷ء"

مولانا کا میری نسبت ایسے خیالات ظاہر کرنا محض انکی ذرہ نوازی ہے وہ میرے احباب میں شامل ہونے کا ننگ گوارا فرماتے ہیں لیکن میری عزت یہ ہے کہ مجھکو اپنے نیازمندوں کے زمرہ میں شامل ہونے کی اجازت دیں، اب چند ہی ایسی صورتیں باقی رہ گئی ہیں جن کو دیکھ کر قدما کی یاد تازہ ہو جاتی ہے، خدا ان بزرگوں کا سایہ قائم رکھے، آمین،

(الندوہ جلد ۴ نمبر ۱۱) ذیقعدہ سنہ ۱۳۲۵ھ مطابق ماہ دسمبر سنہ ۱۹۰۷ء)

ہائے نواب محسن الملک مرحوم

آج ہماری قدیم تعلیم و تربیت کی ایک اور یادگار مٹ گئی، جدید تعلیم ایک مدت سے جاری ہے، اور آج سینکڑوں ہزاروں تعلیم یافتہ بڑے بڑے خدمات پر ممتاز ہیں لیکن قومی عَلم ابھی تک ان ہی لوگوں کے ہاتھ میں ہے جنھوں نے کالجوں کے ایوانوں میں نہیں، بلکہ مکتب کی چٹائیوں پر تعلیم پائی تھی، جدید تعلیم بھی ان ہی کی بدولت پھیلی اور آج خود جدید تعلیمیافتہ گروہ ان ہی کے اشاروں پر حرکت کر رہا ہے،

لوگوں کو ڈر تھا کہ سر سید مرحوم کے بعد ان کے منصوبوں کو کون انجام دیگا؟ لیکن خدا نے ان ہی کے ہمنشینوں میں سے ایک ایسا شخص (نواب محسن الملک) پیدا کر دیا، جو اور امور میں گو سر سید کا ہمسر نہ تھا لیکن کالج کی ترقی وسعت اور مقبول عام بنانے میں سر سید سے کسی طرح کم رتبہ پر نہ تھا، اس نے تھوڑی مدت میں سات آٹھ لاکھ روپیہ جمع کر دیا، کالج کی ہر شاخ اسقدر ترقی کر گئی کہ اگر کوئی شخص جس نے سر سید مرحوم کی زندگی میں کالج کو دیکھا تھا آج جا کر دیکھے تو کالج کو پہچاننا مشکل ہوگا، کانفرنس جو روز بروز پژمردہ ہوتی جاتی تھی، نواب محسن الملک مرحوم نے اسکو دوبارہ زندہ کیا، اور لاہور سے ڈھاکہ تک اس کے ڈانڈے ملا دیئے،

مرحوم ذاتی صفات کے لحاظ سے بھی نادرۂ روزگار تھے، اس درجہ اس عزت انتہا پر اُن کے اخلاق کا یہ حال تھا کہ ادنی درجہ کے آدمیوں سے بہ ادب و عزت ملتے تھے، ملاقات میں

ہمیشہ پیشقدمی کرتے تھے، سب سے جھک کر ملتے تھے اس سے ساتھ نہایت فراخ حوصلہ فیاض سخی اور جواد تھے، اور یہی اوصاف تھے، جن کی وجہ سے انھوں نے عالم کو مسخر کر لیا تھا،

تصنیف و تالیف کے میدان میں بھی وہ مشاہیر کے ہمسر تھے، ان کا ایک خاص لٹریچر تھا جو اُن ہی کے ساتھ مخصوص تھا، قوتِ تقریر میں بھی وہ نہایت ممتاز تھے،

ظاہری صورت و شان سے بھی خدا نے انکو کافی حصہ دیا تھا، ان کے چہرے سے شان ٹپکتی تھی، اور گو وہ سید تھے لیکن تاتاری استخوان کا دھوکا ہوتا تھا،

اخیر عمر میں اُن کو کالج کے لڑکوں کی شورش کا بہت صدمہ ہوا کہتے تھے کہ میں اس رنج سے گھلا جاتا ہوں اور واقع میں میں نے ان کو جب شملہ جاتے ہوئے دیکھا تو ان کی صورت دیکھکر گھبرا گیا، کہ اب یہ آفتاب لبِ بام آپہنچا،

محسن الملک! جا، اور خوش خوش خدا کے سایہ رحمت میں آرام کر، تو درد بھرا دل رکھتا تھا، لوگ بھی تیرے لئے روئیں گے اور بہت روئیں گے،

در روزگار عشق تو، ماہم فدا شدیم　　　افسوس کز قبیلۂ مجنوں کسے نماند

(الندوہ نمبر ۹ جلد ۴)

رمضان ۱۳۲۵ھ مطابق ۱۰ اکتوبر ۱۹۰۷ء

———·———

سلسلۂ مقالات شبلی

یعنی مولٰنا شبلی کے مقالات کے مجموعے جو مذہبی، ادبی، تعلیمی، تنقیدی، تاریخی، اور فلسفیانہ عنوانات کے تحت شائع ہوئے ہیں،

فہرست مضامین جلد اول

(مذہبی)

تاریخ ترتیب قرآن،

علوم القرآن،

اعجاز قرآن،

قرآن مجید میں خدا نے قسمیں کیوں کھائیں،

قضا و قدر اور قرآن مجید،

یورپ اور قرآن مجید کے عدیم الصحت ہونے کا دعوی،

مسائل فقہیہ پر زمانہ کی ضرورتوں کا اثر،

وقف اولاد،

پردہ اور اسلام،

الاسلام،

مسلمانوں کو غیر مذہب حکومت کا محکوم ہو کر کیونکر رہنا چاہیے،

غیر قوموں کی مشابہت،

خلافت،

حقوق الذمیین،

الجزیہ،

اختلاف در مسامحت،

حجم ۲۴۸ صفحے، قیمت: عہ

فہرست مضامین جلد دوم (ادبی)

عربی زبان،

فن بلاغت،

نظم القرآن وجمہرۃ البلاغۃ،

شعر العرب،

عربی اور فارسی شاعری کا موازنہ،

سرسید مرحوم اور اردو لٹریچر،

املا اور صحت الفاظ،

اردو ہندی،

بھاشا زبان اور مسلمان،

تحفۃ الہند (ہندی صنائع و بدائع)

حجم ۱۰۴ صفحے، قیمت: ۱۲ ار

فہرست مضامین جلد سوم (تعلیمی)

مسلمانوں کی گذشتہ تعلیم،

مدرسے اور دار العلوم،

قدیم تعلیم،

ملا نظام الدین بانی درس نظامیہ،

درس نظامیہ،

ندوہ اور نصاب تعلیم،

فن نحو کی مروجہ کتابیں،

تعلیم قدیم و جدید،

مشرقی کانفرنس،

ریاست حیدرآباد کی مشرقی یونیورسٹی،

احیاء علوم اور ریڈیکل،

حجم ۱۰۸ صفحے، قیمت: عمر

منیجر دار المصنفین اعظم گڈھ

(طابع و ناشر محمد ادریس و آرٹی)